

اصحاب کے قلم سے مقدمے دیباچے اور پیش لفظ وغیرہ ہیں، مگر اتنے شاعروں کے کلام کی سطح کا کینا ہونا دشوار ہے، اس لئے ان نظموں میں ناہمواری بہت ہے، مگر بیشتر نظمیں اچھی ہیں اور اس انہماق عقیدت میں ایک خاص جدت ہے،

حیات جمال الدین افغانی

از جناب رضا عبدانی بقیطع اور سنا بختا مست ۱۱۵ صفحات

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت :- ۱۴ روپے چار آنہ

انارکلی گوشہ ادب لاہور

سید جمال الدین افغانی کے متعلق اردو میں کافی لٹریچر موجود ہے، اور بعض اچھی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں، مصنف نے بھی ان کے حالات میں یہ مختصر کتاب تحریر کی ہے، مگر اس میں سید صاحب مغفور کے وطن کی تحقیقات کے علاوہ کوئی نیا اضافہ نہیں ہے، مصنف نے صرف اہم طویل واقعات کا خلاصہ کر دیا ہے،

رسالہ حاصور و پاسور، از جناب حکیم محمد کبیر الدین صاحب بقیطع چھوٹی ضخامت

۱۳۶ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت :- ۱۴ روپے چار آنہ بازار نور لاہور

حیدر آباد دکن

مؤلف رسالہ نامور اور حاذق طبیب ہیں، اس رسالہ میں انھوں نے قبض و بولائیر

کے اسباب و علامات، ان کے اقسام اور ان سے پیدا شدہ امراض و عوارض کے علاج، تدبیر و دواؤں اور پرہیز کی پوری تفصیل تحریر کی ہے، جو اس مرض میں مبتلا مریضوں اور اطباء کے مطالعہ کے لائق ہے،

”م“



جلد ۶۹ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۲ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۲ء

مضامین

۸۲-۸۳

شاہ معین الدین احمد ندوی

شذرات

مقالات

۸۵-۹۳

جناب مولانا سید سلیمان ندوی

نقدیں سیمائی طبع دوم کا مقدمہ

۹۴-۱۰۸ جناب خان بہادر ظفر حسین صاحب ٹیٹارڈ

آل دشتیت

انسپکٹر مدارس

۱۰۹-۱۲۵

جناب ابو محمد اسلم خان رئیس بکڑالہ ضلع جلم

گھڑوں کی تازخ لاکم شدہ ورق

۱۲۶-۱۳۱

جناب محمد معز الدین صاحب علوی بی کام

مکتوب جرنی

۱۳۲-۱۳۳

یوہان کارل توفیل

باب التقریظ والانتقاد

تازخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد اول) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے

۱۳۴-۱۳۸

ڈاکٹر زبیر سیدی قی صدر شعبہ اسلامیات

بزم صوفیہ

کلکتہ یونیورسٹی

ادبیات

۱۵۲-۱۵۵

جناب گلن ناتھ صاحب آزاد

بھارت کے مسلمان

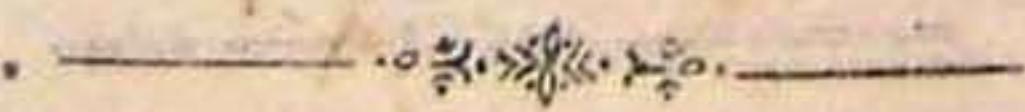
ناشر

۱۵۵ جناب سید ضامن حسین صاحب گویا جہا آباد

۱۵۶-۱۶۰

”م“

مطبوعات جدیدہ



شہادت

افسوس کہ گزشتہ مہینہ ہندوستان اور پاکستان کے کئی اصحابِ علم و قلم نے وفات پائی، ان میں سب سے ممتاز شخصیت مولانا اکرام اللہ خان ندوی کی تھی، مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دورِ اول کی پیداوار اور اپنی علمی و تصنیفی قابلیت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے، ان کا وطن شاہجہان پور تھا، اور تعلیم ندوۃ العلماء میں حاصل کی تھی، انھوں نے مولانا شبلی مرحوم سے باقاعدہ درس تو نہیں لیا تھا، مگر ان کی صحبت کے فیض یافتہ تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد کئی سال تک دارالعلوم کے مشہور رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر رہے، اور کچھ دنوں تک ندوہ کے اہتمام کے فرائض بھی انجام دیئے تھے،

————— ﴿﴾ —————

غالباً سلسلہ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم نے ان کو آل انڈیا مسلم کونسل کانفرنس کے اسٹنٹ سکرٹری کی حیثیت سے علی گڑھ بلا لیا تھا، جس سے وہ آخر عمر تک وابستہ رہے، مولانا شروانی مرحوم کا قیام امور مذہبی کی صدارت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں رہتا تھا، اس نے کانفرنس کا سارا کام مولانا اکرام اللہ خان کے ہاتھوں میں تھا، جس کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے چلایا، کانفرنس گزشتہ کی ایڈیٹر کے فرائض بھی وہی انجام دیتے رہے، اور کانفرنس کی تجویزین اور سالانہ اجلاسوں کی رپورٹیں وغیرہ بھی وہی مرتب کرتے تھے، اور سلسلہ سے لیکر سلسلہ کا کل ۳۰ سال تک کانفرنس انہی کی ذات سے عبارت تھی مرحوم کو ندوۃ العلماء سے بھی گہرا تعلق تھا، اور وہ ہر زمانہ میں اسکی خدمت انجام دیتے رہے،

————— ﴿﴾ —————

بلکہ نہایت متین خاموش، کم آمیز، اور دنیاوی جاہ و شہرت سے بے نیاز تھے، اسی نے علمی دنیا میں ڈی شہرت حاصل نہ کر کے جس کے وہ حقیقتہً مستحق تھے، مگر مسلمانوں کی خاموش مفید علمی و تعلیمی خدمات انجام دینے لندہ اور کانفرنس گزشتہ میں انھوں نے سیکرٹری و علمی تعلیمی اور اصلاحی مضامین لکھے جن کا مجموعہ کئی جلدوں میں آگیا، ان کی مستقل قلمی یادگار نواب وقار الملک کی سوانح عمری وقار حیات ہے، جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، وفات کے وقت ۶۵، ۶۴ سال کی عمر ہی ہوگی، مرحوم کی وفات سے نہ صرف ندوہ کی جماعت بلکہ ہندوستان کے علمی حلقہ میں ایک ممتاز جگہ خالی ہوگئی، اللہ تعالیٰ اس خادمِ علم کو اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے،

————— ﴿﴾ —————

دوسرا حادثہ ملازمہ کی وفات کا ہے، ان کا اصل نام احمد صدیق تھا، مگر ادبی دنیا میں ملازمہ کی نام سے مشہور تھے، بھوپال وطن تھا، اور مدرسہ الہیات کانپور میں تعلیم پائی تھی، مگر حصولِ تعلیم کے بعد خالص ادبی زندگی اختیار کی، وہ اردو میں ایک خاص مزاحیہ طرز کے موجد تھے، جس کا نام انھوں نے گلابی اردو رکھا تھا، ادب و انہی کے ساتھ ختم ہو گیا، ایک زمانہ میں یہ طرز بہت مقبول تھا، مگر او دھند خد بہر سون سے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، اور مرحوم کے قلم میں وہ تازگی اور جولانی باقی نہیں رہ گئی تھی، وفات کے وقت پچاس سے کچھ اوپر عمر ہی ہوگی، بڑی علمی دنیا کے لئے گویا شباب کی عمر ہے، مگر اتنی ہی عمر میں مرحوم نے شہرت و فخر کے ساری مدارج طے کر لئے تھے، اور بالآخر گزشتہ مہینہ زندگی کا آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا، والبقاء للہ وحدہ،

————— ﴿﴾ —————

اسی مہینہ میں پاکستان کے ایک خطا سے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ جنوری کے آخر عشرہ میں مولانا حیدر زمانہ نے وفات پائی، مرحوم سے صرف علمی مراسلت رہتی تھی، اس نے ان کے ذاتی حالات کم معلوم ہیں، ایک زمانہ میں ان کا قیام ٹھکانکوٹ میں تھا، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے ہری پورہ ضلع ہزارہ میں منتقل ہو گئے تھے، مرحوم بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے، اور اپنی علمی و تصنیفی زندگی کے ابتدائی ہی میں ایک خاص حلقہ میں اچھی خاصی

شہرت حاصل کر لی تھی، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدید دور کے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل ان کا ناقص موضوع تھا، اس موضوع پر وہ معارف اور دوسرے رسالوں میں برابر مضامین لکھتے رہتے تھے، اور اسلامی مسائل کے جدید معشرین کے برخلاف ان کا قلم بڑی حد تک محتاط واقع ہوا تھا، متفرق مضامین کے علاوہ مستقل تصانیف میں غالباً صرف ایک کتاب اسلام کا نظریہ سیاست کی قلمی یادگار رہی، مرحوم کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن افسوس موت نے ان کو پوری ہونے کا موقع نہیں دیا، اللہ تعالیٰ اس خادم دین کو اپنی مغفرت سے نوازا۔

..... (پیشہ) ۱۰

معارف شروع سے اب تک ایک روش پر قائم رہی، اور مختلف حالات میں بھی اس نے اپنی ظاہری اور بنیادی خصوصیات میں فرق نہیں کیا، اس لئے پہلے کے مقابلہ میں اب اس کے مصارف چونکہ ہو گئے ہیں، مگر قیمت میں کل ایک روپیہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جو مصارف کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے وہ کئی سال سے خسارہ سے چل رہا ہے اور تقریباً دو سال سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سکے کے تبادلہ کی دشواریوں کی وجہ سے پاکستان کے خریداروں کی تعداد بہت گھٹ گئی ہے جس سے خسارہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

ان حالات میں دوسرا سالہ شکل سے جاری رہ سکتا تھا یا کم از کم ظاہری حیثیت قائم نہیں رکھ سکتا تھا، مگر معارف انشاء اللہ ہر حال میں ایک شان سے علم و ادب کی خدمت میں مشغول رہے گا لیکن اس بارہ میں اردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کے بھی خواہوں کو بھی اپنے فرائض محسوس کرنے چاہئیں عام طور سے لوگوں پر چار روپے سالانہ بھی گران گذرتے ہیں، ایسی حالت میں قیمت میں اضافہ کا کوئی سوال نہیں ہے، مگر اس کی کمی کی تلافی اشاعت سے ہو سکتی ہے اگر اس خریداروں کی تعداد میں محض اضافہ ہو جائے، تو خسارہ آسانی سے پورا ہو سکتا ہے، اگر صرف دانشمندان اور معارف کے قدر و افون کا حلقہ تنگ سی توجہ سے کام لے تو یہ کام کچھ دشوار نہیں ہے، اگر ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان لکھنے والے جیسے رسالہ کو زندہ نہیں رکھ سکتے تو پھر انھیں اردو زبان اسلامی علوم و فنون اور اسلامی کچھ سے زبان ہی ہمدردی کا کیا حق ہے؟

مقالہ

نقوش سلیمانی طبع دوم کا مقدمہ

اردو کا ماضی حال مستقبل

از

مولانا سید سلیمان ندوی

نقوش سلیمانی | آج سے بارہ برس پہلے ۱۹۳۹ء میں جب اردو ہندی، اور ہندوستانی کی بحثیں غیر منقسم ہندوستان میں جاری تھیں، اور زبان کے معاملہ میں کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کے لئے ملک کے خادم بے چین تھے، خاکسار نے اپنی زبان اور ادب اردو کے متعلق ۱۹۱۵ء سے لے کر اس وقت تک جو تقریریں کی تھیں یا تحریریں کیں تھیں ان کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دینا مناسب سمجھا، اور اس مجموعہ کا نام نقوش سلیمانی رکھا، یہ مجموعہ چھپا اور توقع سے زیادہ مقبول ہوا، اور کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوا، کیونکہ اس کے نقوش کے آئینہ میں اردو کا ماضی حال اور مستقبل پوری طرح نظر آتا تھا، ایک ہزار نسخے چھپے تھے، اور وہ چند سال میں ختم ہو گئے، اور دوبارہ ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، احباب اور شائقین کے تقاضے جاری تھے، اسی اثنا میں تین سال ہوئے کہ لاہور سے میرے لائق دوست پروفیسر سید عبداللہ صاحب (پنجاب یونیورسٹی) لکھا کہ نقوش سلیمانی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے، اور اس کے نسخے بازار میں نہیں ملتے، لاہور کے کسی پبلشر سے اس کے چھپوانے کی تدبیر کیجئے، یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کی تقسیم نے صورت حال

دی تھی، اور نئے نقشے کے مطابق سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ کون کیا کرے اور کہاں کرے، بہر حال تقدیر کا کیا پلٹ نے جب مجھے بھوپال سے نکال کر جون سنہ ۱۹۵۵ء میں کراچی پہنچایا، اور غور و فکر کے بعد نئی زندگی کا پھر سے نقشہ بنایا، تو اپنی گزشتہ کتابوں کو یہاں چھاپنے اور چھپوانے کا خیال آیا، تو دوسری کتابوں کے نقوش سلیمانی کے بھی دوبارہ چھپوانے کی تجویز ذہن میں آئی، اور بچہ اللہ کہ اب وہ چھپکے تیار ہے۔

نقوش کا موجودہ نسخہ | نقوش کا موجودہ نسخہ گزشتہ نسخہ کا نقش ثانی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا نسخہ تین بابوں پر منقسم تھا، خطبات، مقالات، اور مقدمات، یہ نسخہ صرف دو بابوں پر مشتمل ہے، خطبات اور مقالات مقدمات کا باب اس نے الگ کر لیا گیا ہے کہ مقدمات کی ایک الگ جلد زیر ترتیب ہے۔ پہلے باب میں ایک نیا خطبہ جو پہلے ایڈیشن کے بعد ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ میں پڑھا گیا تھا، بڑھا دیا گیا ہے،

نقوش سلیمانی کی اہمیت کے بعض وجوہ

نقوش سلیمانی یوں توجہ پرانے ادبی خطبوں اور تحریریں کا مجموعہ ہے، مگر میری خیال میں اس کے اندر اہمیت کی چند خاص باتیں ہیں،

۱۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کے مولد کی تعیین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نظائر کی گئی، اور یہ اشارات سب سے پہلے ۱۹۱۵ء کے اجلاس اردو کے خطبہ صدارت میں کئے گئے، اس میں ۵۵ ابھرنے والے خطبوں اور مقالوں میں ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی (ص ۳۱، ص ۳۲) شروع شروع میں تو اس پر غور کرنے کا سہارا بھی ملتا تھا، مگر تاریخ نے ۱۹۲۶ء میں اپنے کو دہرا کر ماضی کی حقیقت حال کے پردہ میں لا کر سب کے سامنے پیش کر دی، یہاں تک کہ ایک سندھی محقق پیر حسام الدین صاحب نے اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھ کر انجمن ترقی اردو میں ابھی پیش کیا ہے۔

فادری کی سیاسی تاریخی کتابوں میں اردو کا سب سے پہلا فقرہ جواب تک ملا ہے، وہ فیروز شاہ تغلق کے عہد کا ہے، غمہ شاہ تغلق نے جب ۱۲۵۰ء میں ٹھٹھہ پر حملہ کیا، اور اسکی موت سے اس کا یہ حملہ ناکام رہا، اس کے بعد ۱۲۶۲ء میں فیروز شاہ نے دوسرا حملہ کیا، اور وہ بھی ناکام واپس گیا، تو ٹھٹھہ والوں نے کہا،

”برکت شیخ تھیا، ایک مولا اور ایک تھا“ (شمس سراج ص ۲۳۱)

اس فقرہ کا اخیر لفظ شمس سراج عقیق کی مطبوعہ تاریخ میں ”تھا“ اور نہاد و نون پڑھا جاسکتا ہی، مگر صحیح لفظ مقدم نہیں ہوتا، نقوش شمس ص ۲۵۹ میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ

”شیخ کی برکت تھی کہ ایک مرگیا، اور دوسرا ناکام رہا“

لیکن عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۸۸ (الباد) میں اس کا مطلب میں نے یہ لکھا تھا کہ

”شیخ کی برکت ہی ایک مرگیا اور ایک ناکام بھاگا“

مجھے ہمیشہ سے اس لفظ کی صحت کی تلاش تھی، کراچی آنے کے بعد سندھ اور ملتان کے دوستوں سے اس کے تیسری صحیح تلفظ کا پتہ نکلا، جو ملتان میں ”بھاگا“ کے معنی میں ہے، یہی لفظ فارسی میں لکھا گیا ہوگا جو کتاب میں نہایا نہا کی شکل میں چھپا ہے،

یہ ایک جملہ مقررہ تھا جو ایک لفظی تصحیح سے متعلق تھا،

۲۔ دوسری اہمیت اس کتاب کی اس خطبہ صدارت میں ہے جو ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں پڑھا گیا، تھا، یہ خطبہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے آج بھی پڑھنے کے لائق ہے، اس سے انھیں معلوم ہوگا کہ اردو کی اہمیت ان کے لئے کیوں ہونی چاہئے اور انھیں کیوں اس کو اپنی قومی زبان بنانی چاہئے، اب حالات بالکل بدل گئے ہیں، اب دلائل واقعات کی صورت میں ان کے سامنے ہیں، اور اب سارا معاملہ ان کے اختیار میں ہے، اور ان سے اخیر بار بارنا صحابہ یہ کہہ دینا ہے کہ بنگال کی اکثریت کو ہندو کلچر اور ہندو متھالوجی اور ہندو ادب کی غلامی سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی، جب تک وہ اپنی زبان کو سنسکرتی بنگالی اور سنسکرتی خط سے آزاد نہ کریں گے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں مشرقی پاکستان میں کام شروع ہو گیا۔

۳۔ تیسری اہمیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس کے خطبوں اور مضمونوں سے آغاز سے آج تک اردو کی بڑی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، اس کا آغاز اور اس کے عہد بھید کی ترقی، اور اس کے مطبوعات، اور

مشورات کی رفتار شاعت معلوم ہو سکتی ہے، اور اسی پر داز پر آئندہ بھی کام کیا جاسکتا ہے،
۴۔ جو تھی چیز یہ ہے کہ اس کتاب میں اردو کی ضرورت بقا اور اہمیت کے تمام دلائل، واقعات
اور اسباب پوری تشریح سے جمع ہو گئے ہیں، اسی طرح مخالفین کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو
تمام و کمال رفع کر دیا گیا ہے،

۵۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ ان مضامین میں اردو ہندی، ہندوستانی مباحث کے تمام پچھلے واقعات
اور جس جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں متحدہ زبان کے نظریہ کے متعلق تبدیلیاں پیش آتی رہیں، اول
کی پوری روداد جمع کر دی گئی ہے، جس سے یہ معلوم ہو گا کہ پچھلے پچاس برس کے عرصہ میں ملک کی زبان
کا مسئلہ کس کس مرحلہ سے گزرا، اور سمجھوتہ کی کیا کیا کوششیں کی گئیں، اور ان کا انجام کیا ہوا،

۶۔ یہ مضامین گویا سی ہین ہن مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی زبان اور لٹریچر کے مسئلہ کو باریک
سے الگ بھی نہیں کیا جاسکتا، اور اس سلسلہ میں اس کتاب کے مصنف کی حیثیت پوشیدہ نہیں، اس کے
مضامین اس کی اس حیثیت کی پوری غمازی کر رہے ہیں، اس نے ان لوگوں کو جو سمجھوتہ کی ہر پیش
ٹھکرا کر سنسکرتی ہندی کو راشٹر بھاشا یعنی ملک کی زبان بنانے پر مصر تھے ان خطروں سے برابر ہشیا
کیا ہے، جو دو قومی نظریے کا سبب بنے، اور جو بالآخر ملک کی تقسیم کا باعث ہوئے، ۱۹۴۷ء میں
مسلم یونیورسٹی کے اندر یونین ہال میں ہندوستان میں ہندوستانی پر جو متالہ پڑھا گیا ہے، اور جو اس
مجموعہ میں شامل ہے اس کے ص ۳، پر یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں،

ہندوستان میں زبان کا انقلاب ہو کر رہے گا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائے گا
آنا ہی اسکی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان میں دو زبانیں پیدا کرنا
چاہتے ہیں، ان کو ہشیا رہنا چاہئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اندہ ہمالیہ بنادیں
میں اگرچہ ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہو گا، پہلا ہمالیہ چاہئے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے مگر ہندوستان

کو دو متفرق زبانوں میں تقسیم کرنے سے دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسا ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا
جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکے گا،

اس کے بعد کلکتہ اردو کانفرنس کے اجلاس منعقد ۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کے خطبہ صدارت میں جو معارف
جلد ۲۵ نمبر ۲ میں شائع ہوا، اور وہ اس کتاب میں حصہ خطبات کے اخیر میں شامل ہے، ناظرین کو یہ الفاظ
ملیں گے :-

”صاحبزادہ این دوہین، ایک یہ کہ ہم سمجھیں کہ ہندوستان خالص ہندوون کا ملک ہے،
اس میں جو کچھ ہو وہ خالص ہندووانی ہو، زبان وہی ہو، لباس وہی ہو، تعمیر وہی ہو، مذاق
وہی ہو، علم و فن وہی ہوں، اور جو بھی اس ملک کی چار دیواری کے اندر ہو، وہ اسی کو کا محکوم
ہو کر رہے، یہ راہ ہی خطرناک، اور مشکوک سے بھری ہوئی ہے، اور اس راہ کی کامیابی میں بہت
کچھ شک کیا جاسکتا ہو“ (ص ۱۷،)

”میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت و وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس
ملک کے مختلف بنے والے بھی وہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہوسکیں، ان کی وہی موروثی اور
پُرانی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالیہ اور سمندر کی چار دیواری میں بند کر دیا
ان میں چھوٹ اور اچھوت کی پرانی لڑائی، ہزاروں برس سے کھڑی کر رکھی ہے، اور جس
تاریخ کے ہر دور میں ان کے اندر نفاق پیدا کیا ہے، اور ان ہی کے اندر کے مظلوم فرقوں کو مجبور
کیا ہے کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈیں، اور باہر والوں کو اپنی مدد کے لئے اپنے گھر بھائیوں، اور غریب
میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں اسیر کر لیں، یہ ایک تاریخی نکتہ ہے جسکی
تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر جس کو کسی موقع پر بھولنا نہیں چاہئے“

”اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا اور سمجھنا کہ سنسکرتی ہی ہندی ہماری اصلی بولی ہونی چاہئے،
دیس کے اتحاد اور ایکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے“ (ص ۱۸۰)

”میرے خیال میں یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہیں، بلکہ کھلی دشمنی ہے، اور مسلمانوں کے
ذہن میں یہ غلطی بھائی ہے کہ جب ہم ادھا اختیار پا کر یہ کر رہے ہیں، تو پورا اختیار پا کر کیا کچھ نہ
کریں گے، ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو اثر اب پڑ رہا ہے، اور جو آگے پڑے گا، وہ چھپا
نہیں، میں نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے امید ہے کہ ہمارے دوست اس کو نہ بھولیں گے،
سینکے، اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھیں گے“ (ص ۲۸۲)

اس سے بھی زیادہ صاف اور روشن لفظوں میں پھر ہمارا کیا گیا :-

”ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ہندوستانی اردو یا اس کو
آسان ہندی کہہ لیجئے، ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، اور خالص ہندی کی حیثیت وہ ہے جو
مسلمانوں کی فارسی کی ہے، اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے، اگر ہم سب اس تصفیہ پر
ایک ہو جائیں تو ہماری سب مشکلیں دور ہو جائیں، مگر افسوس ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا
ہے جو نہ صرف ہندی بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہوا ہے، اور وہ
ایک ایسی غلطی کر رہا ہے جس سے قومی تنگ دلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہیں پہنچ سکتا
اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے“ (ص ۱۸۲)

سب سے آخر میں آخری تنبیہ ان لفظوں میں پیش کی گئی :-

”میں پھر ہندو مسلمانوں دونوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ تنگ دلی اور جھوٹی قومیت کی
غلطی پاسداری کر کے اپنے ملک کو تباہ نہ کریں، اور کشتی میں وہ سوراخ نہ کریں جس سے وہ
پھر کبھی نہ بن سکے گی، اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہوا“ (ص ۱۸۹)

مگر یہ سب تدبیریں بیکار ہیں، اور وہی ہوا جس کا ہونا مقدر تھا، اور اردو ہندی کا جھگڑا جو ۱۸۵۷ء
سے شروع ہوا تھا، مسئلہ میں اس طرح طے ہوا کہ دونوں دو منطقوں میں بٹ گئیں جن میں سے ایک
بھارت اور دوسرا پاکستان،

بھارت میں اردو کا مستقبل | بھارت نے گوارہ دے کر سرکاری اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے اپنا پچھا چھپا
لیا، لیکن کیا عوام کے بول چال اور ایک طبقہ کی ادبی (لٹریچر) حیثیت سے بھی اسکی زندگی آئندہ باقی
رہے گی یا نہیں، اس کے پہلے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہندی کی عمومیت عوام میں اتنی مقبولیت
دست نہ حاصل کر لے کہ وہ عوام کی زبان بن جائے، عوام کو اردو کی ضرورت باقی رہے گی، اور یہ کام ایک
دو دن کا نہیں، بلکہ صدیوں کا ہے، دوسرے ٹکڑے کا جواب یہ ہے کہ یہ اس طبقہ کی ہمت اور محنت پر
موقوف ہے، تاہم چونکہ لڑکوں کی تعلیمی زبان سنسکرتی ہندی بنادی گئی ہے اس لئے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ
اس زبان میں فارسی اور عربی عنصر کم ہوتا جائے گا، اور ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھتے جائیں گے
اس لئے دو تین نسلوں کے بعد عجیب نہیں کہ بھارتی اردو پاکستانی اردو سے الگ ہو جائے، تاہم جب تک
بھارت میں مختلف زبانیں موجود ہیں، آسان اردو یا ہندوستانی کی شکل میں اردو کا وجود ضروری ہے
وہ کسی کے مٹائے مٹا نہیں سکتی، کیونکہ زبان نہ مٹائی جاتی ہے، نہ بنائی جاتی ہے، وہ خود قدرت کے
اصولوں پر چلتی اور مرتی ہے،

پاکستان میں اردو کا مستقبل | پاکستان نے گوارہ دے کر اپنی سرکاری زبان مان لیا ہے، لیکن چونکہ پاکستان کے
حصہ میں وہ صوبے آئے ہیں جن میں سے ہر صوبہ کی اپنی ایک صوبہ کی زبان بھی ہے، اس لئے پاکستان کو
اپنی سرکاری زبان کو تعلیمی زبان بنانے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہے، تاہم یہی حقیقت کہ پاکستان
کے ہر صوبہ کی الگ الگ صوبہ دار زبان ہے، پورے پاکستان کے لئے ایک واحد متحدہ زبان کی ضرورت
بالطبع اور مسلم ہے، اور اسی بنا پر پاکستان میں اردو کا مستقبل شاندار ہے، اور اس کا پرچم پنجاب کے مضبوط

ہاتھوں میں آتا نظر آتا ہے،

یہ بھی قدرتِ الہی کی عجیب محنت تھی کہ چونکہ پنجاب کو آئندہ پاکستان کا دل بننا تھا، اس لیے موقع پیدا ہوئے جن میں لاہور جدید اردو کی نشوونما کا مرکز بن گیا، اور بجائے اس کے کہ پنجاب پنجابی کو اپنی ادبی اور لٹریچر اور تعلیمی زبان بنائے، اُس نے اردو ہی کو اپنی ادبی اور لٹریچر اور تعلیمی زبان بنایا، اور سب زیادہ اردو کی اشاعت کا کام سہین ہوا، اور یہ سب تہمید و فراز میں اس نے کی گئی تھی پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں اردو کی حیثیت مہاجر کی نہ ہو، بلکہ اہل وطن کی ہو،

مہاجرین کی جو بڑی تعداد بہارِ یوپی، اُتر پردیش، حیدرآباد، اور راجستھان وغیرہ ریاستوں سے آئی ہے، وہ اردو کو اپنے سینوں کے ساتھ لگا کر لائی ہے، اور یہ سارے پاکستان میں جنگل سے لے کر پشاویں تک پھیل گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہر صوبہ میں اردو بولنے والوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے، اور اُن کے ذریعہ سے اردو پاکستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی ہے،

اردو کے لئے سب سے مشکل مرحلہ سندھ اور بنگال میں تھا، مگر ان مہاجرین کے بدولت اردو ان دونوں صوبوں کی گلی گلی میں پھیل گئی ہے، اور ہر جگہ وہ بولی اور سمجھی جانے لگی ہے، بلکہ بیوپار اور تجارت کی راہ سے وہ بازارِ وں پر قبضہ پا رہی ہے، اور کراچی پر تو پورا قبضہ اردو ہی کا ہے، اندرون سندھ میں صوبہ کی زبان کے ساتھ ہماری قومی زبان دوش بدوش ترقی کر رہی ہے، چنانچہ پشاور، راولپنڈی، لاہور، حیدرآباد، سندھ، کراچی، ڈھاکہ اور سلطنت سے اردو زبان کے اخبارات اور رسائل کثرت سے نکلتے ہیں، اور پڑھتے جا رہے ہیں، پنجاب کے سرکاری دفاتروں میں وہ داخل ہو رہی ہے، اور یونیورسٹی کی تعلیم میں اُس کے ذریعہ تعلیم بننے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، کراچی میں ایک پورا کالج سارے مضامین کی تعلیم اردو میں دے رہا ہے، اسی طرح سندھ اور بنگالی اسکولوں میں سندھی اور بنگالی کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائی جا رہی ہے، پھر تعلیم کا ہون میں سندھی اور بنگالی طالب علموں کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھائی جا رہی ہے

پھر تعلیم کا ہون میں سندھی اور بنگالی طالب علموں کے ساتھ ہندوستان سے آئے ہوئے طالب علم بھی پہلو پہلو کلاسوں میں تعلیم پا رہے ہیں، اس کے دواثر نمایان طور پر ظاہر ہو رہے ہیں، ایک یہ ہے کہ ان صوبوں کے طلبہ اردو بولنے چاہنے کا موقع پا رہے ہیں، اور عملاً اُن کی مشق بڑھ رہی ہے، دوسرا یہ کہ سندھی اور بنگالی سنسکرتی ہندی کے بجائے اردو سے ہم آہنگ ہو رہی ہے،

مملکتِ پاکستان کی عام زبان ہونے کے باعث اردو ایک اور میدان میں بڑھ رہی ہے، اور وہ ہر دنی ممالک میں، وہاں کے سفراء یہاں آ رہے ہیں، یہاں کے سفراء وہاں جا رہے ہیں، نتیجہ میں اردو دوسرے ملکوں کے حدود میں قدم جا رہی ہے، مصر و شام کے سفراء اور سیلون کے ہائی کمشنر اردو سیکھ رہے ہیں، عبدالوہاب عوامی سفیر مصر اور عمر بہاء الامیری سفیر شام، اردو بولنے اور تقریریں کرنے لگے ہیں، سیلون کے ہائی کمشنر برہان الدین جیسا سمجھ لیتے ہیں، اور کچھ بول بھی سکتے ہیں، عوام بے اقبال کے اردو کلام کا عربی میں ترجمہ کر رہے ہیں، اسی طرح ہمسایہ ممالک ایران، عراق، بحرین اور کویت میں یہ اپنا قدم جما رہی، پاکستان کی زبان ہونے کی بنا پر بعض یورپین بھی اسے سیکھنے میں شوق دکھا رہے ہیں، یہ سب آثار نیک اور اردو کے مستقبل کی تابناکی کا پتہ دیتے ہیں،

دارالمصنفین کی ایک نئی کتاب

اہل کتاب صحابہ و تابعینؓ

جس میں تراویح ایسے صحابہ، صحابیات، تابعین، اور تابعات کے سوانح اور کارنامے درج ہیں جو نہ ہونا ہو دی اور نصرانی تھے، اور مشرف باسلام ہوئے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں جزیرہ عرب میں یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ، اُن کے تمدنی و سیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی حالت کی تفصیل بیان کی گئی ہے، قیمت: ۱۰ روپے (مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین)

”منہج“

مال و مشیت

از

جناب خانبہادر ظفر حسین صاحب رٹائرڈ انسپکٹر مدرس

۱۹۴۷ء کے جون میں اس مقالہ کی پہلی قسط اور ستمبر میں دوسری قسط معارف میں شائع ہوئی تھی، اخیر قسط ماہیت زمانہ کے سوال پر ختم ہوئی تھی، یہ تیسری قسط اسی سوال کا کچھ اور چار سال کے بعد جو اپنے سماجی و مصنوعی زمانہ کے لغت میں اس سے بڑھ کر مصافحت کی اور کیا سوائی ہو سکتی ہے، لیکن حقیقی زمانہ کے پیمانہ میں جو موجودہ قسط کا موضوع بحث ہے، شاید آپ کو مردہ زمانہ ماننے کے لئے خطا ہی نہ ملے، اور اس لئے میری مہذرت کے بجائے شاید خود آپ کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئے، اصل یہ ہے کہ باطنی اوزان اور ہین اور ظاہری اور غالب کسی ایسے ہی موقع پر اپنی صفائی یوں پیش کی تھی،

ہاں کہ عاشق سنن رنگ دنام چیت در امر خاص حجت دستور عام چیت

مردم نے طرف مکان کے ساتھ طرف زمانہ کی اصطلاح چلا کر وقت کو بھی مکانی بنا دیا، بالوں کیے کہ یہ ان کا مکانی تصور فہم عامہ کا پرتو تھا، جو زمین کی طرح زمانہ کو بھی طرف سمجھتی ہے، اور جس طرح سطح زمین پر عمارات، باغات اور مختلف اشیاء دوش بدوش دیکھی اور تصور کی جاسکتی ہیں، زمانہ کے طرف میں بھی تصور کیا جاسکتا ہے کہ یکے بعد دیگر پیش آنے والے واقعات کو یکے بعد دیگر چنے ہوئے رکھے ہیں،

سماجی ضرورتوں نے اس خیال کو اور تقویت دی، کھلا کھلا ایجا ہوئی، اور برابر برابر کے بارہ حقون میں منقسم ڈائل نے گویا دنیا کے سامنے زمانہ کا چہرہ پیش کر دیا، لیکن کیا خبرتیراں، ٹائم میس، گویا آن وقت کا نام ہیں، یا حقیقی وقت کی پیمائش کر سکتی ہیں، کیا صدیاں، سال، مہینہ، ہفتہ، دن پہر گھنٹے، منٹ اور سکندھ صبح معنی میں وقت ہیں؟

آپ کو زمانہ کے مکانی مرتبہ دیکھنا ہوں تو زمانہ حال کے کسی اسکول میں تاریخ کے کمرہ کا مانتہ فرمائیے، اس کمرہ کی چاروں دیواریں آپ کو ٹائم چارٹوں اور لائن آف ٹائم (خط زمانہ) سے بسی ہوئی نظر آئیں گی، ان چارٹوں میں صدیوں کو انچون میں تحویل کر کے خطوط کی مدد سے وقت کا امتداد دوتنا ظاہر کیا جاتا ہے، اور پھر اس مکانی رعایت سے تاریخی واقعات ان پر پھیلا دیے جاتے ہیں، علیٰ ہذا اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے نقشوں میں سال بہ سال کی ترقی ایک مستقل مکانی پیمانہ میں دکھائی جاتی ہے، اور ان تمام ذرائع اظہار کا تصور زمانہ مکان کے تصور سے سو فیصدی آلودہ ہوتا ہے، فلسفہ کی اکثر و بیشتر جستجو یہی ہے کہ زمانہ کا ایک ایسا نمبرہ تصور حاصل کرے، جو مکان اور اس کے متعلق تصورات کی آلودگیوں سے پاک ہو، اور جس کو وقت کا تصور محض کہہ سکیں،

وقت کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے ایک نظر اس کے ارتقائی مفہوم پر ڈال لینا ضروری ہے، سب سے پہلے زمانہ کی وہ صنف ہے، جسے ہم زمانہ محسوس کہہ سکتے ہیں، اور ذرہ کی زندگی میں ہمارے شعور کے اندر احساسات کی آمد و رفت کا تاننا بندھا رہتا ہے، مختلف کیفیات یکے بعد دیگر ہمارے نفس پر طاری ہوتی رہتی ہیں، ان سب کا تماشہ زمانہ کا پہلا دھندہ لا سا شعور ہے، ہم سڑک پر ایک موٹر جاتے ہوئے دیکھتے ہیں، اس کے بعد ہماری توجہ ایک دکان کی آرائش کی جانب مائل ہو جاتی ہے، پھر دوسری دکان سے ریڈیو کی آواز ہمارے شعور پر قبضہ کر لیتی ہے، اس کے بعد ہمارے ذہن میں اس کام کا خیال خطور کر رہا ہے، جس کو انجام دینے ہم گھر سے نکلے تھے، سب مل جل کر حال

ماضی، اور مستقبل کا احساس ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، حال کے احساس کے ذمہ دار تو بہت کچھ ہمارے حواس خمسہ میں، لیکن ماضی کا احساس حافظہ کی وساطت سے اور مستقبل کا احساس تخیل کے عمل سے ہوتا ہے، تپش اور حرکت قلب سے بھی مرور زمانہ کافی اچھلا احساس ہوتا ہے، یہ گویا انسان کے لئے جسمانی گھڑی کے پرزے ہیں، جن کے شمار سے وقت کا حساب لگ سکتا ہے،

زمانہ محسوس ہر شخص کا پراکٹ تجربہ ہے، اُس کے مقابل میں سماجی وقت ہے، جو سوسائٹی کے ہر فرد کے معاملات سے ہوتا ہے، اور جس کے بغیر تیل گاڑیاں، ہوائی جہاز، ہمنڈر کے جہاز، کارخانے اور دیگر معاشرتی کاروبار چل نہیں سکتے، چنانچہ تمام سوشل زندگی کی مشین کسی کسی سماجی وقت کی دڑاؤ (داپر چلتی ہے)،

تمدن کے ابتدائی دور میں اگرچہ وقت کی تقسیم اس قدر سائنٹفک نہ تھی، جیسا کہ اب ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی کی ضرورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ تقسیم اوقات، ہر ملک اور ہر قوم میں یہی ضرورت دیکھائی اب بھی دن رات کو آٹھ پہروں میں تقسیم کرتے ہیں، چار پہرات، چار پہرون، اور آفتاب کے طلوع و غروب، دو پہر، سہ پہر کو دونوں کے بولنے، اور موشیوں کے واپس آنے سے وقت کا اندازہ کرتے، اور ان علامتوں کے حوالہ سے آپس میں وقت کا تقرر کرتے ہیں، چنانچہ یورپ کے ترقی یافتہ طبقوں میں اب بھی گھڑی کے جالے نمبر کے آنے کا پتہ دیتے ہیں، اور روپن چڑیا جاڑے کے موسم کی نقیب ہے، ہندوستان میں کوئل موسم برسات کا اعلان کرتی ہے، ایران میں بلبل موسم بہار کا، ہندوستان میں اس وقت متعدد سماجی سال رائج ہیں، فصلی سمیت، عربی، انگریزی وغیرہ اور طلوع آفتاب سے دوسرے دن طلوع آفتاب تک وقت کی جو میں گھنٹوں میں تقسیم سب سے زیادہ سہل ہے، اور اس نے عام طور پر دنیا کے تمدن ممالک میں رائج ہے، یوں دیکھائی اب بھی سال کو موسموں یا فصلوں میں تقسیم کر کے اپنے معاملات کی قرارداد کرتے ہیں، غیر تمدن آبادیوں میں دنوں کے

گھڑی کو گھڑی پر نشان کر دینے سے شمار کیا جاتا ہے، چنانچہ جزیرہ سلیمان میں اب بھی جب کوئی تقریب ہوتی ہے، تو جن کو بلایا جاتا ہے، اُن کے پاس ایک ایک ڈوری بھیج دی جاتی ہے جس میں متعدد گڑھ ہیں ہوتی ہیں، ہر روز ایک گڑھ کاٹ دی جاتی ہے، جس روز ایک گڑھ رہ جائے اسی روز تقریب ہے، ہندوستان میں خاندانوں میں مین نے دیکھا ہے کہ سال گرہ کی رسم بھی اسی اصول پر انجام پاتی ہے، جب بچہ اپنی زندگی کا ایک سال پورا کرتا ہے تو کلاہ کی ڈوری اس کے سر پر لکھ کر کوئی بزرگ خاندان گرہ باندھ دیتا ہے، اس گرہ میں اگر چاندی یا سونے کا چھلہ، پان اور تہری دوپٹ لگاس کی پٹیاں بھی باندھی جاتی ہیں، شروع میں شاید یہ گرہ اندازی اس لئے ہونی ہوگی کہ گرہین گن کر عمر کا شمار کیا جاسکے،

علیٰ ہذا شمار و حساب کی سہولت کے لئے بعض وحشی قبائل میں اب بھی چاند کی شکلوں کے اعتبار سے ہر مہینہ میں چند مخصوص دن حوالہ کے لئے مقرر کر لئے جاتے ہیں، سال بھی اکثر مختصر ہوتا ہے، چنانچہ بربرین میں چھ ماہ کا سال ہوتا ہے، حالانکہ جزیرہ میں دو موسم ہوتے ہیں، ایک سرد اور ایک خشک، جنتی اور گھڑی نشاء، جدیدہ کے جیسا اور مذکور ہوا، رائج الوقت پانے میں، سائنسدان سکند کاہنر وان حصہ بآسانی ناپ سکتے ہیں، اور یہ تو ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر ہماری گھڑی دو منٹ سے تیز چلنے لگے، تو طبیعت میں الجھن پیدا ہونے لگتی ہے، اور اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا جب تک گھڑی ساد سے گھڑی کی رفتار درست نہ کرالیں،

جوانات کو بھی وقت کا احساس ہوتا ہے، چنانچہ رومینس (Romans) نے اپنے رسالہ ذہانت جوانات میں ایک مہنس کا ذکر کیا ہے، جو مہنسہ میں ایک مقررہ دن پر یعنی جمعرات کو جس بازار لگتا تھا، گرے ہوئے دواؤں چلنے کے لئے آتا تھا، ایک ہفتہ بازار نہیں لگا، لیکن مہنس اپنے دستور کے مطابق آیا، راقم الحروف سے ایک صاحب نے اپنے کتے کا قصہ بیان کیا، جس کو کھوئے ہوئے طویل مدت گزر گئی تھی، ایک روز وہ اپنے نئے مالک کے ساتھ بازار جا رہا تھا، کتے کے قدیم مالک کو کچھ شبہ ہوا، انھوں نے

کئے کا اصلی نام لیکر آواز دی (دوسرے مالک نے کئے کا کچھ دوسرا نام رکھ چھوڑا تھا) کئے نے فوراً اپنی دیکھا اور بے تحاشا اپنے پرانے آقا سے لپٹ گیا، ہارش ہو چکی تھی، مرکز کون پر کیچڑ تھی، ہر خپہ اصلی آقا سے ڈانٹ ڈپٹ رہے تھے، مگر گتا جوشِ مسرت سے اُن کے اوپر چڑھا جا رہا تھا، اور اُن کے کپڑے کچرہ بن گئے، پت کئے دے ہا تھا اس قبیل کی بہت سی مثالیں ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حیوانات کو کچھ کچھ وقت کی اٹکل ضرور ہوتی ہے، مذکورہ بالا مثالوں میں ہمیں کو مستقبل کی اٹکل تھی اور کئے کو ماضی کا اندازہ تھا، جس میں وہ اپنے پرانے آقا کی جگہ تلاش کر کے ماضی کے واقعات کا حافظہ کی مدد سے استحضار کر سکتا تھا۔

زمان کی دوسری صنف زمانِ مقصور ہے، یعنی وقت کا تصور محض جس میں احساسِ کاشا بہت کم ہوتا ہے، جس طرح دیگر محسوسات سے تجربہ کر کے ایک تصور بنایا جاتا ہے، مثلاً دیوانِ حافظ، دیوانِ میر، دیوانِ آتش سے دیوانِ محض کا تصور جو کوئی محسوس دیوان نہیں، لیکن سب کا کلی تصور ہے، اور سب محسوس محسوس دیوانوں پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح محسوس زمان کی مثالوں سے ایک مجرد تصور زمانِ ذہن اخذ کر لیتا ہے، جو مکان کی طرح تین ابعادِ ثلاثہ رکھتا ہے، یعنی حال، ماضی، مستقبل،

زمان کی تیسری صنف مابعد الطبیعیاتی زمان ہے، جو محسوس زمان سے زیادہ حقیقی، اور قائم بالذات ہے، زمان کا یہ جوہر یا عین، اپنا ایک حقیقی وجود رکھتا ہے، جو ایک طویل بحث کا محتاج ہے، لیکن کسی مابعد الطبیعیاتی بحث سے قبل ایک نظر اسی راہ کے سائنسی اکتشافات پر ڈال لینا نہایت مفید بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے، اس لئے زمان کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو پیش کرنے سے قبل ضروری ہے کہ سائنس کی تحقیقات کا ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے،

شروع شروع میں ترکیبِ فطرت کا نظریہ یہ تھا کہ موجودات ذرات سے مرکب ہیں، اور ذرات اُن موجودات کے اجزاء یا تجزی ہیں، ہر ذرہ ناقابلِ نفوذ ہے، اور اس لئے کوئی ذرہ اس مکان میں نہیں پس سکتا، جہاں دوسری ذرہ کی بود و باش ہو، ہر ذرہ ہر سمت حرکت کر سکتا ہے، چنانچہ

خطواتِ حرکات ایک دوسرے کو منتقل اور ذرات اپنے ہر سفر کے بعد ایک ہی وقت میں اپنے اپنے مقام پر آجاتے ہیں، لیکن جب وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، تو اس ٹکڑ سے اُن کے حرکات کی سمت بدل جاتی، تو اُن نظریہ کے مطابق ہر ذرہ میں قوتِ حرکی مخفی تسلیم کی گئی ہے، جس کی بنا پر وہ ایک خطِ مستقیم میں ایک مقررہ رفتار پر حرکت کرتا یا کسی مقررہ مقام پر قائم رہتا ہے، ستر مویں صدی عیسوی کی طبیعیات کا حاصل یہی تھا جو دراصل قدیم یونانی نظریہ ذریت ہی کی ایک جدید شکل تھی، یہی نظریہ دو صدیاں اور ماہرینِ سائنس کی فکر پر مبنی رہا، چنانچہ حرکتِ ذرات کا تصور نیوٹن کے وقت تک سائنس کا محور خیال رہا،

نیوٹن کی فکر سامنے ہر ذرہ کو کششِ ثقل بخشی، چنانچہ حرکت کی تشریح کے لئے ایک چھوڑ دیا تین زمین ہو گئیں، ایک تو وہی پرانا خیال، یعنی یہ کہ ہر ذرہ میں حرکت کی قوت ودیعت ہے، اور اُن کا تصادم ہوتا ہے، دوسرے نیوٹن کی کششِ ثقل،

نیوٹن کے نزدیک مکان ایک خلا، محض تھا، جس کو آگے چل کر سائنس نے اتھر سے بھرا، اتھر ایک ایسا مادہ تھا، جو ناقابلِ تقسیم تھا، نامفراحم تھا، لطیف تھا، بسیط تھا، پکدار تھا، اور اپنے مقام پر قائم بھی غرض کہ وہ ان صفات سے اس وجہ سے متصف تھا، کہ ذرات کی لہروں کو بے کم و کاست اپنی فضا میں آگے بڑھتا چلا جائے، یا پھر یوں کہئے کہ اتھر کو فرض ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہ لہریں فریضہ انجام دے، ظاہر ہے ایک ایسا مجموعہ اعداد و زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا تھا، اور زمانہ حال کے محققین سائنس کو اس سوچ پر اب دلکشا جان ڈالنے کے کیما کی اکتشافات نے پرانے نظریہ ذریت میں ایک سچی گدی اور پلیدی کی وہ یہ کہ ہر عنصر کے ذرات جدا جدا طبعی خصوصیات رکھتے ہیں، لیکن یہ فرق کیفی نہیں بلکہ کمی ہے، چنانچہ ڈالٹن کے نظریہ کے مطابق ذرات اپنی مقدار اور وزن کے لحاظ سے مختلف تھے، لیکن طبیعیات کی نظر میں ہر ذرہ مادہ کی ایک ٹی اور آخری جزو کی حیثیت سے یکساں اور مساوی الوزن تھا، چنانچہ پچاس برس کا پرانا تصادم جو کششِ ثقل اور لطیف اتھر میں پیدا ہوا تھا، وہ طبیعیات کے مادہ اور کیمیا کے مادہ میں از سر نو رونما ہو گیا،

حقی کو برقیہ (الکٹران) کے اکتشاف نے طبیعیات اور کیمیا میں صلح کرائی، مشہور عالم ماہر طبیعیات ہارو کے اکتشاف کے مطابق ہر ذرہ چند منفی و مثبت برقیون پر مشتمل ہے، ہر ذرہ کا ذواۃ یا مرکز مثبت برقیون (پروٹون) سے بنا ہوتا ہے جس کے چاروں طرف منفی برقیون کا حلقہ ہوتا ہے، ہر کیمیائی عنصر میں مثبت و منفی برقیون کی تعداد مختلف ہوتی ہے، منفی برقیے اپنی ذواۃ کے چاروں طرف گردش کرتے رہتے ہیں لیکن عناصر میں ان کی گردش کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہوتی ہے، جدید طبی تحقیقات کے مطابق ہر ذرہ نظام شمسی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، جس کا ذواۃ یا مرکز آفتاب اور منفی برقیات دیگر اجرام فلکی کے قائم مقام ہیں، ہر ذرہ کی کیفیت ایک برقیہ کے حذف و اضافہ سے تبدیل ہوتی ہے، الغرض اب ہمارا جزیرہ ذرہ نہیں بلکہ برقیہ یا الکٹران ہے،

چنانچہ ہر ذرہ کی خصوصیت برقیہ کی نوعیت پر مبنی ہے، نہ کہ اس کے وزن پر اور یہ نوعیت قطار کی ہے، ہر برقیہ کا ایک مخصوص انداز رقص ہے، اسی ہذا اب ہائڈروجن کی نوعیت برقیون کی تعداد و ترتیب نہیں، بلکہ ان کے مخصوص انداز رقص سے متعین تصور کی جاتی ہے،

ہر برقیہ اپنی آخری تکمیل میں حرکت کے سوا کچھ نہیں، چنانچہ کائنات کا ہر ذرہ ایک حرکت ہجانے کے بعد زمان ہی کا ایک عمل ہو گیا، اور مادہ کے خصوصیات اور اخلاق و حیات کے خصوصیات کا فرق مٹ جاتا ہے، جس طرح اخلاقیات میں ہر انسان اپنے عمل سے اور حیاتیات میں ہر عضو یہ (آرگینزم) اپنے فعل سے جانا پہچانا جاتا ہے، اسی طرح اب طبیعیات میں مادہ کے ہر عنصر کی شناخت اس کے عمل اور فعل ہی سے کی جاتی ہے، کلاسیکل طبیعیات کی شدید غلطی یہ تھی کہ اس نے حرکت کو مادہ سے جدا کر دیا تھا،

جدید نظریہ کے مطابق مادہ سراسر ایک عمل یا حرکت ہے، اور اس لحاظ سے زندہ اور مردہ مادہ میں کوئی فرق نہیں، چنانچہ الکٹران ڈر کے نزدیک زمان (جو حرکت کا ہیولی ہے) نفس اور مکان

اس کا جسم بنے ڈھانٹ ہڈ کی نظریں کل کائنات ایک عظیم الشان عضو یہ ہے،

ان امور پر ان اثنائے نظریہ اضافیت کا اور اضافہ کر لیجئے جس کے لحاظ سے حرکت ایک اضافی شے ہے اور زمان و مکان مل کر ابجد ثلاثہ میں ایک چوتھے بعد کا اضافہ کرتے ہیں، چنانچہ عمر کا حال ازید کا قبل، اور کچھ کا ماضی ہو سکتا ہے، قدیم طبیعیات کی نظریں زمان و مکان لا انتما تھے لیکن جدید طبیعیات کی نظریں حرکات مختلف و متعین واقعات کی صورت میں اپنی تشکیل کرتے ہیں، یا ایک حرکت دوسری حرکت کو بالکل کاٹ دیتی ہے، اور اس کی کوئی قدر و قیمت، اور اس کا کوئی وجود نہیں رہتا، چنانچہ زمان و مکان محدود متعین ہیں، اور نظریہ اضافیت کے رو سے ان کی نامتناہیت کی اگر کوئی شکل ہے، تو وہ یہ ہے کہ مادہ کے سفر کی راہ میں تمام کائنات میں بجائے مستقیم ہونے کے منحنی ہیں، چنانچہ ہر خطا گھوم بھر کر اپنے ابتدائی نقطہ پر واپس آ جاتا ہے، اس لحاظ سے اسے لامتناہی کہہ لیجئے، اگرچہ حقیقت میں وہ محدود ہے، اس لئے کہ وہ ایک متعین مفہوم رکھتا ہے، ایو کریش نے سوال کیا تھا کہ اگر عالم محدود ہے تو بتائیے کہ اس کے کنارہ پر پہنچ کر اگر نیزہ پھینکا جائے، تو کہاں جائے گا؟ اس سوال کا جواب، کائنات کے خطوط منحنی سے جو ہر حرکت کی مقررہ راہ میں ہنشی بخش مل جاتا ہے،

چونکہ تمام عالم کی ہر حرکت و عمل تسلیم کر لیا گیا ہے، اس لئے اب سربراہ دروہ محققین سائنس مثلاً ڈاکٹر جنس کا خیال ہے کہ وہ کسی محرک و عامل کا محتاج بھی ہے، چنانچہ موجودہ سائنس مادیت کے مرکز سے ہٹ کر اب اس راہ پر آرہی ہے، جس کے راہبر افلاطون، ارسطاطالیس، گیلیلیو، نیوٹن، اکانت، اور ہیکل تھے،

میری یادداشت یہاں تک قلم بند ہو چکی تھی کہ ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کے ہندوستان ٹائمز میں گلوب کے والد سے ایک خبر نقل سے گزری کہ سٹر جارج ڈی لاڈل جو آکسفورڈ شاہ کے ایک ممتاز انجینیر ہیں، ایک ایسی شے ایجاد کی ہے جو ماضی کے واقعات کی تصویر کھینچ سکتی ہے، چنانچہ ایک علمی انجمن میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے

کہا کہ حکومت کے امتناعی قوانین کی پابندیوں کی وجہ سے وہ اُس آلہ کا مظاہرہ تو پیش نہیں کر سکتے لیکن اس کے نتائج بیان کر سکتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنی شادی کی جس کو بیس سال ہو گئے تھے تصویر کھینچی ہے اور ایک مفقودہ پتھر شخص کا اس کی تصویر پاس آلہ سے عمل کر کے پتہ چلایا ہے، انھوں نے بتایا کہ یہ آلہ اس نظریہ کے اصول کی بنا پر بنایا گیا ہے کہ ہر خیال ہر عمل اور ہر واقعہ سے فضائیں کچھ ایسی مخصوص لہریں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو دوسری لہروں سے ممتاز و جدا کیا جاسکتا ہے، اور یہ لہریں فضائیں ہمیشہ قائم رہتی ہیں چنانچہ آلہ کو اُس واقعہ، خیال یا عمل کے زمان و مکان پر لگا دینے کے بعد اُس کے اندر لہریں اسی طرح آنے لگتی ہیں، جیسے ٹیلی وزن ریڈیوسٹ میں

طبیعیات کی ان جدید تحقیقات کے ساتھ ایک نظریاتیات کی جدید تحقیقات پر بھی ڈال لیجئے، یہ نظریہ تو عرصہ سے مسلم تھا کہ کچھ مظاہر تو ایسے ہوتے ہیں، جن کے اسباب کا ہم استقرار سے سراغ لگا سکتے ہیں لیکن کچھ مظاہر ایسے ہوتے ہیں جن کے اسباب کا استقرار سے پتہ نہیں چلتا، مثلاً ٹنک، سموڈیم، لکڑیوں کی ترکیب بنتا ہے، لیکن اُس کے ذائقہ اور اُسکی بلوریں شکل کو ان دونوں اجزاء سے دور کا بھی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا، یہ دونوں فاصیے یعنی ذائقہ اور شکل بالکل نئے پیدا ہو جاتے ہیں، دوران ارتقاء میں یہ فجائی عمل ہمیشہ کار فرما رہتا ہے، چنانچہ مارگن نے اس موضوع پر اپنی کتاب کا نام ہی ارتقاء فجائی (امرجنٹ ایوولیوشن) رکھا ہے، ارتقاء میں بارہا ایسے مقامات آتے ہیں جب اجزاء سے ترکیبی ایک نئی ترتیب و تنظیم اختیار کر کے بالکل نئی شے پیدا کرتے ہیں، جیسے مردہ مادہ سے حیات کا پیدا ہو جانا، کائنات گویا ایک ایسا بلند مینار ہے، جو متعدد منزلوں میں منقسم ہے، بقول مارگن اس مینار کی پہلی منزل ذات کا اجتماع ہے جس کو ہم ذریت کہہ سکتے ہیں، پانی نام ہے آکسیجن کے آپ کے ذرا اور ہائیڈروجن کے دو ذروں کی کیمیائی ترکیب کا، اس منزل کے اوپر دوسری منزل وہ ہے جہاں ذرات باہم گریں کر سالمات بناتے ہیں، چنانچہ اس تنظیم کو ہم سالمیت کہہ سکتے ہیں، اس کے اوپر تیسری

منزل ہے، یا تیسری تنظیم ہے، جو ذرات و سالمات کے منت نئے ملائق سے ترتیب پا کر بلور کی شکل میں رنڈا ہوتی ہے، جسے ہم بلوریت کہہ سکتے ہیں، اس کے اوپر چہم نامی کی منزل ہے، جس کا مابعد الاتیاز حیات جو سب کے اوپر ترتیب و تنظیم کی ایک بالکل انوکھی شکل نمودار ہوتی ہے، جس کو نفس کہتے ہیں، ہر نئے طبقہ کا نمودار مارگن کے خیال کے مطابق کسی مخفی قوت کی کرشمہ سازی ہے، اب اس کا نام خواہ قوت رکھ لیجئے یا نفس یا خدا (ارتقاء فجائی ص ۳۶، ۳۵)

تاریخ فلسفہ شاہد ہے کہ ہر عہد میں سائنس کے اکتشافات کا نقطہ آخر، مابعد الطبیعیاتی فکر کا نقطہ آغاز ہوتا ہے، اس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے، سوال یہ ہے کہ موجودہ سائنسی تحقیقات کا وہ کونسا اخیر نقطہ ہے جس سے ہم آئندہ مابعد الطبیعیات کا خطا کھینچنا ہے، جو سائنس کی تمام تحقیقات کے لئے جو شاہدہ پر مبنی ہیں، عقلی بنیاد کا کام دیکھتا ہے،

سائنس کے سارے اکتشافات کا حاصل ہم نے ابھی دیکھا کہ حرکت ہے، جو اپنی آخری تخیل میں تو ارتقاء اور عدم تقلیب ہے، چلتی ہوئی ٹرین اور ساکن ٹرین میں کیا فرق ہے؟ چلتی ہوئی ٹرین پٹری پر متواتر اپنا مقام بدلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، یعنی اس کی حرکت میں تواتر، تغیر اور عدم تقلیب ہے، اسی تواتر تغیر اور عدم تقلیب کے مجموعہ کا نام زمان ہے، چنانچہ حرکت دوسرے لفظ میں زمان ہے، اور اس لئے اکثر فلاسفہ مثلاً سقراط، ارسطو، اکنوڈٹر (مختلف مکان، زمان اور الوہیت) حرکت کو زمان ہی کہتے ہیں، اور جن کی نظریں حقیقی زمان کا مرتبہ ماورائی و مابعد الطبیعیاتی ہے، وہ حرکت کو زمان معروضی کہتے ہیں،

اس تقدیر سے ساری کائنات کا ہیروئی زمان ہی ہوا، اور اس لحاظ سے جب ہم کائنات یعنی معروضی زمان پر نظر کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ ارتقاء حیات اپنے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد رکھتی ہے جس میں یہ حرکت تحویل ہو کر پھر آگے بڑھتی ہے، اور پھر آگے کے مقصد میں تشکل ہو کر اور آگے بڑھتی بڑھتی، اور مختلف منازل طے کرتی کرتی موجودہ منزل ارتقاء تک پہنچتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معروضی زمان

صرف ایک جہت رکھتا ہے یعنی مستقبل یا اُسی منظر کو دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقاصد جن کا مستقر مستقبل ہے کشش کی ایسی لہریں ایکٹران کی جانب پھینک رہی ہیں کہ جس کے اثر سے کشان کشان یہ اُسی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں، چنانچہ اصل مستقبل کی جانب جانے والے ایکٹران کی نہ ہوئی، بلکہ مستقبل کی جانب سے ایکٹران کی سمت آنے والی لہریں، اس لئے زمان کی رفتار سے مستقبل کی جانب نہیں، بلکہ حقیقتہً مستقبل سے حال کی جانب آنے والی ہوئی، چنانچہ بعض حکما کا یہی عقیدہ ہے کہ زمان کی رفتار مستقبل سے حال کی جانب ہے، نہ کہ ماضی سے حال میں ہوتی ہوئی مستقبل کی جانب، مثلاً مقناطیس کی پرکشش لہریں لوہے کے ٹکڑوں کی حرکت پر مقدم ہیں، اور لوہے کے ٹکڑوں کا مقناطیس کی جانب کھینچ کر حرکت کرنا، اصل حرکت یعنی جذب مقناطیس کی معروضی و ظاہری شکل ہے اصل حرکت جذب ہے انجذاب انوی منظر ہے، جو ہمارے پیش نظر ہوتا ہے لیکن ہم اسی کو حقیقی منظر سمجھ لیتے ہیں،

لیکن حرکت کائنات جسے سائنس نے ثابت کیا اور جسے مابعد الطبیعیاتی زمان میں ہم نے بھی معروضی زمان کہا اپنی گذران کی پیمائش کے لئے ایک در زمان کا محتاج ہوا، اس کو ہم موضوعی زمان کہیں گے اور چونکہ موضوعی زمان معروضی متحرک زمان کا پیمانہ ہے اس لئے موضوعی زمان کو غیر متحرک اور قائم تسلیم کرنا ہوگا، اگرچہ جہان تک محسوس ہونے کا تعلق ہے، ہمیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گویا موضوعی زمان گزر رہا ہے، چنانچہ اکثر فلاسفہ نے تو اترا دراکا و تصورات کی بنا پر نفسی یا موضوعی زمان ہی کو رد ان تصور کیا ہے لیکن اس کی ایک بدیہی مثال یہ ہو کہ جب آپ ٹرین میں بیٹھے ہوتے ہیں، جو اپنی پٹری پر رکی ہوئی ہے، اور دوسری ٹرین کو دیکھتے ہیں جو حرکت میں ہے، آپ کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ آپ کی ٹرین جا رہی ہے، اور دوسری ٹرین جو فی الواقع حرکت میں ہے، رکی ہوئی ہے، اصل واقعہ کی تصدیق آپ دوسری کھڑکی سے پیٹ فارم کو دیکھ کر کرتے ہیں، اور پھر صحیحہً اسے یہ قائم کرتے ہیں کہ دراصل آپ کی ٹرین قائم اور دوسری ٹرین متحرک ہے،

بہر طور اگر معروضی زمان متحرک ہے جیسا کہ مسلم ہے، تو اس کی پیمائش کے لئے دوسرا زمان کلاک کے ڈائل کی طرح ساکن ہونا ضروری ہے، جو متحرک سویوں کو بتاتا رہتا ہے کہ اب وہ کس ہندسہ پر پہنچیں، اور چونکہ غایات کائنات کو مختلف مقناطیسی مرکزوں کی حیثیت سے ہم نے قائم تصور کیا ہے، اس لئے ان کا مقام معروضی زمان کے اندر نہیں ہو سکتا، جو مسلسل متحرک ہے، یا حرکت ہی حرکت ہے بلکہ ان کی جگہ گھڑی کے ڈائل کے ہندسوں کی طرح موضوعی زمان ہی ہو سکتی ہے، جن کو ہماری فکر جو اپنی ماہیت میں خود موضوعی زمان ہی ہے، احاطہ کر سکتی ہے، یعنی غایات عالم جو معروضی زمان سے روپوش ہیں، موضوعی زمان کے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں بلکہ ایک محاف سے موضوعی زمان کے اجزائے ترکیبی ہیں، اس لئے کہ موضوعی زمان کے تمام قائم لمحات انہی غایات ثابتہ سے مرکب ہیں،

انسان چونکہ جسم و نفس سے مرکب ہے، اس لئے اس میں دونوں زمان یعنی معروضی و موضوعی زمان کار فرما ہیں، دماغ کے ارتعاشات، معروضی زمان کی حرکت ہیں، جن کی پیمائش کا آلہ نفس یا موضوعی زمان ہے،

موضوعی زمان میں انسان کا پورا مستقبل منظر ہے، اور اس کا کامل شعور ناممکنات سے مبرا بشرطیکہ موضوعی زمان کو معروضی زمان کی میکانیکی پیمائش سے فرصت ملے، اور ایسا ڈیٹا یعنی عرض طول حجم اور معروضی زمان کی انجھون سے سانس لینے کا موقع ملے، جیسا کہ بعض اوقات عالم خواب میں ہوتا ہے جی ڈبلوڈن نے تجربات زمان میں اسی نظریہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور کثیر التعداد خوابوں کی تحلیل کر کے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ خواب میں دوجہ و شامل ہوتے ہیں، ایک ماضی کا عکس اور دوسرے مستقبل کا پرتو، چنانچہ انہوں نے بہت سے خوابوں کی مثال دی ہے جن میں مستقبل کے واقعات کی جھلک نظر آتی تھی، اور پھر وہ واقعات پیش آئے، اسی کے ساتھ ڈیٹا کا نظریہ دیگر ماہرین نفسیات کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ انسان سوئے اور خواب نہ دیکھے، ہوتا یہ ہے کہ خواب کے نقوش بہت جلد محو ہو جاتے ہیں، چنانچہ خواب یاد

کرنے کی تدبیر ڈالنے یہ بتائی کہ انسان بیدار ہو کر یہ سوال نہ کرے کہ میں کیا خواب دیکھ رہا تھا، بلکہ یہ سوچے کہ میں ابھی ابھی کیا خیال کر رہا تھا، جہاں ایک کڑی یاد آئی، پھر سارا خواب از خود یاد آتا جائے گا، دورانِ تجربہ تکیہ کے نیچے ہمیشہ کا غذا اور نپل رکھنا چاہیے، اس لئے کہ سو جانے کے بعد یاد آیا ہوا خواب پھر فراموش ہو جائے گا، اور پھر اُسے یاد کرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا، آنکھ کھلتے ہی خواب کو یاد کر کے کاغذ پر ٹانگ لینا چاہیے، معروضی زمان کے شیشہ پر موضوعی زمان کا فوکس ہمیشہ حال کے نقطہ ہی پر رہتا ہے چنانچہ ماضی کی یاد بھی حال ہی میں واقع ہوتی ہے، اور مستقبل کی جھلکیاں بھی حال ہی میں نظر آتی ہیں معروضی زمان کا لمحہ جب تک متحرک نہ ہو اپنی ماہیت میں اقلیدس کے نقطہ نظر سے مختلف ہینین چنانچہ اگر آپ کسی چلتے پھرتے آدمی کا کسی تیز لینس والے کمرے سے فوٹو کھینچیں تو تصویر کچھ اس طرح آئے گی کہ ایک پاؤں آگے بڑھا ہوا، اُس کے ساتھ ایک ہاتھ بھی آگے بڑھا ہوا، داہنے پاؤں کی ایڑی اٹھی ہوئی اور بائیں پاؤں کا پنجہ اٹھا ہوا، تیز لینس کے کیمرے بند وق سے بھگتی گولی تک کا فوٹو لیتے ہیں جن کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ہماری نظر کوئی کوہنیں دیکھ سکتی لیکن وہ فوٹو میں ساکن ہی معلوم ہوتا ہے، غرض کہ جب تک معروضی زمان کے لمحہ میں حرکت نہ ہو یعنی زمان میں امتداد نہ پیدا ہو، زمان کے اندر توازن و تغیر کے خصوصیات پیدا نہیں ہوتے، اور زمان و مکان میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی،

الگزڈر مکان کو زمان کا جسم تصور کرتا ہے زمان روح ہے، اور مکان جسم، لمحہ اور نقطہ قیام و سکون میں واحد ہیں لیکن نقطہ کو حرکت دیدیجئے، تو خط کی تخلیق ہو جاتی ہے، خط کو حرکت دیجئے تو سطح کی تخلیق ہوتی ہے، اور سطح کو حرکت دیجئے تو کعب بن جاتا ہے، چنانچہ ابعاد و شامہ زمان ہی کے حرکات کی پیداوار ہیں اس لئے مکان زمان کا مخلوق ہے،

مقولات (categories) جس پر ارسطو طالیس، کانت، ہگل اور دیگر فلاسفہ نے مختلف نقطہ نظر سے بحث کی ہے، مکان کی طرح معروضی زمان ہی کی مخلوقات ہیں، ابعاد و شامہ

کی تخلیق کے ساتھ، زمان ماہیت اور اُس کے تحتانی مقولات: وحدت، کثرت، اور کلیت کی بھی تخلیق کرتا ہے، قیام مختلف غایات کے حصول پر معروضی زمان کے حرکات کے نقشوں میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ کلیت کے مقولات اثبات، نفی، تحدید کی تشکیل کرتے ہیں، اسی طرح معروضی زمان کے توازن و تغیر اس کی اُس فطری رفتار سے جو ہمیشہ غایات کی جانب رہتی ہے، غلیت، معلولیت، تعامل، عرضیت اور جوہریت کے مقولات رونما ہوتے ہیں، چوتھا مقولہ (کانت کے نظام فلسفہ کے مطابق) یعنی جہت کے تحت جو مقولات متعین ہوتے ہیں، یعنی امکان و محالیت، وجود و عدم، وجوب و اتفاقیات، یہ تمام مقولات بھی مختلف غایات کے حصول و عدم حصول سے مرتب و معین ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان تمام مقولات کی حیثیت معروضی ہے نہ کہ موضوعی، فلاسفہ قدیم کا یہ عام دستور رہا ہے کہ جو شے ادراک سے باہر ہو اُسے نفسی اور غیر معروضی قرار دیدیتے ہیں، حالانکہ جو شے فکر سے حاصل ہو کر ادراک میں شامل ہو کر اُس کا اتمام کرے، وہ کچھ کم معروضی نہیں، چنانچہ ہمارے ادراکات میں تصورات کا بیشتر حصہ شامل رہتا ہے، مثلاً مخاطب کی پشت آپ کے سامنے نہیں، لیکن تصور مخاطب کے ادراک میں اُس کا بھی اضافہ کرتا ہے، اور اگرچہ وہ براہِ راست محلِ ادراک نہیں ہے، بلکہ موضوع تصور ہے، مخاطب کے ادراک سے خارج نہیں کی جاسکتی اور نہ اُس کو غیر معروضی کہا جاسکتا ہے، اس لحاظ سے تمام مقولات غیر تجربی نہیں، بلکہ تجربی ہیں، اور فنا میں اُسی طرح اپنا وجود دیکھتے ہیں، جیسے رنگ و بو، سُرخ رنگ کا سبز رنگ سے امتیاز شعاعوں کے انحراف و مختلف ارتعاش پر مبنی ہے، اور یہ حرکات اپنی آخری کلیں میں چاہے وہ عرضی صفت جسے عرف عام میں ہم رنگ کہتے ہوں، نہ رکھتی ہوں لیکن رنگ کو ہم ارتعاش سے جدا نہیں کہہ سکتے، اور سامنس کی زبان میں اسی کا نام رنگ ہو، مابعد الطبیعیاتی نظریہ کے تحت رنگ و بو، ارتعاش، المر با حرکت ہونے کی حیثیت سے زمان ہی ہے، جو مظاہر عالم (Phenomenon) کے میدان میں ایک حرکت اور سلسلہ علت و معلول کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جو اُس کی معروضی حیثیت ہی، اور ذاتِ شے

(Noumenon) کے بدلے میں اقداار، غایات، معانی، یقینات اور مقدمات کی شکل میں قائم ہوتا ہے یا تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ موضوعی زمان کا مبدان ہے

موضوعی زمان کا حال جو فی نفسہ قائم ہے لیکن معروضی زمان کی حرکت کی وجہ سے متحرک نظر آتا ہے، ایسا ہی ہے، جیسے نفسیات میں توجہ کے مرکز کا جو محسوسات کے تغیرات کے ساتھ بدلتا معلوم ہوتا ہے، ورنہ اپنی ماہیت میں اس سے زیادہ نہیں کہ ارادہ نے شعور کو سمیٹ کر توجہ کی شکل میں ایک جگہ قائم کر دیا ہے، (اور ہمارے ارادہ کی آزادی کی یہ سب سے پہلی جھلک ہے، موضوعی زمان کا ہیولی تا مترادہ ہے، افکار، تصورات، اقداار اور غایات اسی ارادہ کے مخلوقات ہیں، ان میں رد و بدل اور ترتیب و تنظیم تمام تر اسی کے ماتحت ہے، انسان اپنی جسم کی وجہ سے جس قدر معروضی زمان میں مجبور ہے، اسی قدر موضوعی زمان کے میدان میں قادر و آزاد ہے، اور توجہ کے مرکز کی پہنائی جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی، اتنا ہی اس کے احاطہ نظر میں مستقبل و ماضی کا زیادہ حصہ آجائے گا، نفس انسانی میں جہان اور ملکات و قوی ہیں وہاں ایک ملکہ یا قوت تاریخت (Historicity) بھی ہے جس کو ماہرین نفسیات نے بالکل نظر انداز کیا ہے، اسی تاریخت کی ترقی پر زمان کے ناقص و کامل تصور کا دار و مدار ہے، تاریخی قوت انسان میں دیگر قوی کے مقابلہ میں دیر میں پیدا ہوتی ہے، چنانچہ ذہنی پیمائش کے ماہرین نے تاریخ اور وقت کے امتحانات ۱۰ سال کی عمر سے شروع کئے ہیں، اسی ہذا قوموں کی نفسی ترقی کا اندازہ بھی اسی تاریخی احساس سے کیا جاتا ہے، جن قوموں میں تاریخی احساس پہلے بیدار ہوتا ہے، وہ ان قوموں سے افضل ہوتی ہیں جن میں تاریخی احساس یا تاریخت بیدار نہ ہوتی ہو، یا بعد کو رونما ہوتی ہو،

مقالات سبلی جلد ششم

ان تاریخی مضامین کا مجموعہ مولانا مرحوم نے اہم تاریخی مباحث پر لکھا، اور جن کو رسائی شلی سے کیا گیا ہے

منہج

(جدید ڈیشن) قیمت :- ۱۰ روپے

گھڑوں کی تاریخ کا مشہور وق

از

انجناب راجہ محمد اسلم خان رئیس بکرا ضلع جھلم

مؤرخ جیدہ معارف جلالی، اگست ۱۹۳۷ء میں جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے گھڑوں پر اپنا تنقیدی مقالہ شائع کیا ہے، اس میں بکوالہ فرشتہ تحریر کیا ہے، کہ گھڑ قوم نے انڈیا کی حمایت میں سلطان محمود غزنوی سے جنگ کی، میں نے ایک عریضہ ادارہ معارف کو اس کی تحقیق کے لئے تحریر کیا، کہ کیا واقعی گھڑوں نے سلطان سے جنگ کی تھی، کیونکہ گھڑوں کا قویہ دعویٰ ہے کہ وہ سلطان محمود کی قیادت میں ہندوستان آئے، ادارہ مذکور نے وہ عریضہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کی خدمت میں ارسال فرما دیا، چنانچہ جناب سید صاحب نے معارف مارچ ۱۹۳۷ء میں اس کا جواب شائع کیا، اور یہ بھی لکھا کہ میری کتاب گوہر نامہ جس کا وہ ترجمہ کر رہے تھے، مکمل ہو چکی ہے، جو عنقریب شائع ہوگی، اس میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہے، اس نے خیال ہوا کہ اس کو دیکھنے کے بعد پھر اس مسئلہ پر تنقید کی جائے، مگر ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ اب تک شائع نہیں ہوئی، اس لئے مجبوراً مواد قلم کے ذریعہ اس کے متعلق بعض معروضات پیش کئے جاتے ہیں،

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ایک کلمہ مشق ادیب اور فاضل یگانہ بین، تاریخ پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی دنیا اور قارئین معارف ان سے بکوالہ واقعت ہیں، ان کے مقالہ پر مجھ جیسے بھی ان کا قلم اٹھانا پڑی جبات، لیکن چونکہ محترم سید صاحب نے اپنے مقالہ جلالی ۱۹۳۷ء میں قوم گھڑ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس پر قوی

حیثیت سے اور اس پر سلسلہ میں جو لکھا ہوا ہے، اس پر ذاتی حیثیت سے اپنے خیالات ظاہر کرنا ضروری ہے ان مقالات میں پانچ بنیادی مسائل ہیں اس نے دیگر امور کو نظر انداز کر کے انہی پر کچھ عرض کرنا ہے، یہ مسائل حسب ذیل ہیں،

۱۔ کیا گھڑ قوم عہدِ فراسیاب میں داخل ہندوستان ہوئی ہے،

۲۔ اسے زردہ و دوتی چند نے اپنی تعریف کے گوہر نامہ میں واقعی سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کا ذکر کیا ہے،

۳۔ کیا گل چند گھڑ تھا، اور تھمس اور پٹن کے عہد میں ہندو مذہب رکھنے والے گھڑ واقعی موجود تھے،

۴۔ لفظ گھڑ کا اصلی اطلاق کیا ہے،

۵۔ گھڑوں کے اسلام قبول کرنے اور کثرت بول کی ہیروہ روایت سے بنیاد ہے،

معارف جولائی ۱۹۳۸ء میں جناب مولانا ابوظہر صاحب نے لکھا ہے کہ جن مورخوں نے لکھا ہے کہ گھڑ قوم پہلی دفعہ محمود غزنوی کے ساتھ آئی، وہ یقیناً غلط واقعہ ہے، کیونکہ فرشتہ نے تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ پنجاب کے راجہ اندپال سے جب محمود غزنوی جنگ آرا ہوا، تو گھڑ قوم اندپال کے ساتھ تھی، پھر اسی صفحہ پر ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں، لیکن صحیح ترین اور قریب قیاس وہ روایت مجھے معلوم ہوتی ہے، جو فرشتہ نے ابراہیم غزنوی کے حالات میں تحریر کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ

سلسلہ میں ابراہیم غزنوی پنجاب پہنچا، پہلے احمد دھن، پھر قلعہ روپال کو فتح کیا، (اس

قلعہ کو میرے خیال میں کشمیر کے نیچے راوی بندھائی اور جوں کے درمیان ہونا چاہیے) اس کے بعد

شہرہ کی طرف بڑھا، اس میں خراسانی نسل کے لوگ آباد تھے، وہ کے نام باشندے ان

کرکشی خراسانوں کی یادگاہ تھے، خواہ فراسیاب کے حملوں کے باعث ہندوستان ہجرت کر گئے

تھے، اگر خود یہ شہر آباد تھا، لیکن باشندے بت پرستی میں مبتلا تھے، اس شہر میں ایک حوض آباد تھا

ہیں کہ قطر ایک سیل تھا، اور اس کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا، اس حوض میں پانی اس کثرت سے جمع ہوتا تھا کہ باوجودیکہ یہ ان انسان سب ہی سال بھر تک استعمال کیتے تھے، مگر کم نہ ہوتا تھا، شہر کے چاروں طرف گہناں خنک تھے، اس نے شہر بھی دکھائی نہ دیتے تھے، میرے خیال میں یہ وہ گھڑ تھے جو کابل نہ گئے، اور اسی جگہ مقیم ہو گئے، جس کا ذکر آئے گا

فرشتہ کی تائید خود اس کتاب سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ مولف لکھتا ہے،

تاریخ بدعہالان میں لکھا ہے کہ ملک دھن جس جگہ آج آباد ہے ایک زمانہ میں کشمیری ڈل

کی طرح زیر آب تھا، بابر بادشاہ نے اس کو پسند کر کے آباد کرنے کا حکم دیا، ملک چند قانون گو اس

کام کے لئے متعین کیا گیا، ان لوگوں نے گھڑی گالہ کی طرف سے پانی نکال ڈالا، اور خشک ہو گیا

کئی گاؤں آباد ہو گئے، اور گھڑی گالہ کہنے کی وجہ یہ ہو کہ چند سوار اس کی گہرائی معلوم کرنے کے لئے

اس میں گھس گئے، لیکن چونکہ وہ خاصہ گہرا تھا، اور کچھ پڑا ہوا، گھڑی اس میں بھٹیں کر غرق ہو گئی

سوار بڑی مشکل سے جان بر ہوا، اسی نے گھڑی گالہ کے نام سے یہ مقام مشہور ہوا

پھر اگست ۱۹۱۵ء کے معارف ص ۱۱۹ میں تحریر کرتے ہیں،

”سلسلہ کے ضمن میں فرشتہ نے سلطان ابراہیم کے شہرہ فتح کرنے کا حال لکھا ہے اس کا

ہیان ہے کہ یہ لوگ اہل ذہن خراسانی الاصل تھے، جن کو ترکوں نے وہاں سے نکال دیا تھا، میر خیاں

ہے کہ یہ قطعی غیر مسلم گھڑ تھے، اور جس تالاب کا ذکر کیا ہے وہ بابر کے عہد تک موجود تھا، یہ گھڑوں

کے مختلف قبائل میں سے ایک تھا، ان کا سب سے بڑا سردار مہپال نامی تھا

اس طویل اقتباس کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سید صاحب کے تمام دلائل پیش نظر ہو جائیں،

اخباری زندگی جہلم مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۳۸ء میں میرے محترم اور فاضل دوست راہہ کفایت علی خان

صاحب پنوار آدن جندوٹ ضلع جہلم نے جو راجپوت گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، اور جن کو تاریخ

سے بڑا شغف ہوا اور جن کی متعدد تاریخی تصانیف ان کی دستِ معلومات کی شاہدین، اپنے ایک مقالہ گھڑی گالہ میں لکھتے ہیں:-

”تحصیل چکوال کے مشہور پہاڑوں جتا اور تحصیل جہلم کے پہاڑوں جلی کے درمیان ایک جگہ گھڑی گالہ کے

نام سے موسوم ہے“

اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ گھڑی گالہ تحصیل چکوال کے پہاڑوں چپا اور جہلم کے پہاڑوں جلی کے درمیان واقع ہے، اور اس تمام علاقہ کی خصوصیت یہ نہیں ہے جیسا کہ فرشتہ نے بیان کیا ہے کہ سلطان ابراہیم گوربات وغیرہ کی وجہ سے تین دینہ تک تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، اس علاقہ میں سردیوں میں زیادہ سے زیادہ بارش دو یا تین یوم تک رہتی ہے، یا کہ اس سے بھی غیر معمولی بڑے تو ہفتہ سے کبھی ابھی زیادہ نہیں ہوتی لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے، اور گرمیوں میں تو ایک دن سالم بھی کبھی نہیں ہوتی، پھر مسلسل دو یا تین ماہ تک بارش کا ہونا اس علاقہ پر بالکل منطبق نہیں ہوتا، اس معاملہ میں سید صاحب مقامی حالات کی ناواقفیت سے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں، فرشتہ کی تائید میں گھڑی گالہ والی روایت کو تائید میں پیش کرنا بھی صحیح نہیں ہے، اور اس سے یہ بھی بخوبی ثابت ہو گیا کہ خراسانی نسل کے باشندے یہاں مقیم نہ تھے بلکہ کسی دوسری جگہ آباد ہون گے، اب اس گنتی کا سچا نامہ اور اس جگہ نخل و قورع کا تعین جو افسانہ اور تاریخ کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں، اب ایک اور حقیقت کا اظہار کر دینا بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے، جس سے میرے دعویٰ کو تقویت پہنچتی ہے، وہ یہ ہے کہ گکھڑوں کی مردم شماری سنہ ۱۸۵۱ء میں ہوئی، بھوانی گکھڑوں آف دی ٹرائب ٹوٹھ سرڈینزل انٹن گورنر پنجاب اور اس دورہ میں غزنویوں نے جو اسیران جنگ گرفتار کئے، ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، جن میں سے بیشتر شیش جنگ تھے، اس سے ثابت ہوا کہ یہ گکھڑ تھے، اب چونکہ مولانا ابو ظفر صاحب کے ان خیالات کی تاریخی حقیقت و شواہد سے تردید کی جا چکی ہے، کہ خراسانی نسل کو فرسیاب نے جہاں وطن کیا تھا، گھڑی گالہ کے علاقہ میں آباد نہ تھے، اور نہ یہ خراسانی نسل کے گکھڑ تھے

میں نے اس پر کچھ لکھنا بے سود ہے، البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر گکھڑ کب ہندوستان آئے، یا وہ ہندوستان پہنچے، گکھڑوں کا زمانہ قدیم سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کی مہمیں میں وارد ہندوستان ہوئے اور ان میں ہمارے مورث اعلیٰ گکھڑ شاہ کو یہاں کا تمام علاقہ انتظام کے لئے سپرد کیا، دراصل یہ قوم ایرانی اصل ہے ابھی ہمارے درباری تواریخ کے گوہر نامہ کے مصنف کا بھی بیان ہے، اور سیر المتاخرین کے مؤلف نے بھی اپنی تاریخ میں ولایت گکھڑان کی فتحیابی کے عنوان کے ماتحت حسب ذیل مسطور تحریر کی ہیں:-

”یہ ولایت سندھ اور بہت کے درمیان واقع ہے، وہاں کے حاکم ہمیشہ اسی قوم کے رہے ہیں“ کسی بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے بعضوں نے لکھا ہے کہ قدیم سے یہ ولایت کشمیر میں داخل تھی سلطان محمود غزنوی نے اس کو فتح کر کے اپنے ایک امیر کے سپرد کی، اُس وقت سے اُس کی نسل گکھڑ مشہور ہوئی“

مولانا قبا س سے سیر المتاخرین کے اردو ترجمہ مرآۃ السلاطین جلد اول مطبع نوکلشور بلوچستان کے ۱۹۶۱ء میں ہے: نیز سیر المتاخرین کے اس فقرہ نے کہ بعضوں نے لکھا ہے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض قدیم مؤرخین بھی صاحب سیر المتاخرین کے ہم خیال ہیں،

مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی بھی اس کے مؤید ہیں، جس پر ان کا مقالہ شائع شدہ معارف جہاں شائع ہوا ہے،

سید ابو ظفر صاحب نے خود بھی جولائی سنہ ۱۸۵۱ء میں اس امر کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ”جن تواریخوں نے لکھا ہے کہ گکھڑ قوم پہلی دفعہ محمود غزنوی کے ساتھ آئی، وہ یقیناً غلط ہے“

ہے، کیونکہ فرشتہ نے تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ انہیں پال راجہ پنجاب سے محمود غزنوی جنگ آزمایا ہوا، تو گکھڑ

قوم انہیں پال کے ساتھ تھی“

فرشتہ کے بیان کی تردید خود سید صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں کی ہے، جو انھوں نے میر

ایک عریضہ کے جواب میں معارف نمبر ۲۹ میں لکھا تھا، اس میں رقمطراز ہیں:-

میرے اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ واقعی فرشتہ اپنے بیان میں منفر د ہے، اور تا وقتیکہ اس کی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہ ہو یقینی نہیں کہ سکتے، فرشتہ کے تین نسخے میرے پاس موجود ہیں، حیدرآباد کے نسخہ میں کھڑک لکھا ہے، دوسرے کوشور میں کھڑک تحریر ہے، تیسرا ۱۲۳۷ء غائبانہ سو کتابت سے بحری کی بجائے عیسوی تحریر کی گیا ہے، جو بی بی کے انگریز کپٹن کے زیرِ رحمت طبع ہوا ہے، اس میں بھی کھڑک ہی لکھا ہے، پس ممکن ہے کہ یہ لفظ کھڑک مفرس ہوتا

سید صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ انھوں نے فرشتہ ہی کے بیان کی بنیاد پر محمود کے ہمراہ گکھڑوں کے ہندوستان میں آنے سے انکار کیا تھا، اور جب میرے توجہ دلانے پر دوبارہ تحقیقات کی تو بجز فرشتہ کے ان کو کسی اور تاریخ میں بہرہ دایت نہیں ملی، اس لئے یقین سے کہ اب ان کو اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہو گا، کہ جن مورخوں نے گکھڑ قوم کا محمود کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہونا بیان کیا، انہی نے صحیح حقیقت بیان کی ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے،

بعض انگریز مورخین نے بھی گکھڑوں کو ایرانی الاصل تحریر کیا ہے، راجہ شیر محمد خان جنجوعہ مرحوم جبکہ برقی جو مدت العمر تاریخ جنجوعہ اور گکھڑ کا مطالعہ کرتے رہے، انھوں نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا، کہ مجھے اب بانی یاد نہیں، باب پنجاب چپیس سرسپل گریفن میں ہے یا رپورٹ بند و بہت اول ضلع ماہ پینڈی میں ہے، فرزانہ کا خان دیک کا بیان ہے کہ سلطان محمود نے کھوکھڑوں کو شکست دینے کے بعد نیلاب میں اپنے سرداروں میں ایک سردار کو افسر مقرر کیا، سردار موصوف سردار سکندر حیات مرحوم سابق وزیر اعظم پنجاب کی برادری کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں،

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے راجہ سردار علی خان کے جواب میں مئی ۱۹۳۷ء کو حسب ذیل گرامی نامہ تحریر فرمایا،

جیٹری ملی، یا داندی کے لئے مشکور ہوں، تاریخ اور مقدمہ دونوں مکمل ہو کر پریس میں جانے والے ہیں، ایک مقالہ معارف میں بھیج دیا ہے، اشاعت ہونے پر آپ کے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے، کیا فی النسل ہونا اور ہندو ہونا دو متضاد باتیں نہیں ہیں، اور دونوں ہو سکتے ہیں، گو کسی دوسری تاریخ سے کیا فی النسل ہونے کی تائید نہیں ہوتی، لیکن تردید بھی نہیں ملتی، اور اگر واقعہ صحیح ہو، تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، آج ہارون الرشید خلیفہ بغداد کی نسل سے عباسی ہندوستان میں بہت ہیں، سلطان محمد کے نسلی افراد پراچا قلعہ دہلی میں موجود ہیں، آپ کے پاس فارسی جرنالہ ہے، اس کا نام اور مصنف کا نام جلد تحریر فرمایا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ میرے پاس بھی ہے یا نہیں، اور انگریزی تاریخ کا بھی نام مصنف کا نام بھی لکھیں، اپنی قوم کے نام کا املا بھی لکھیں، کتابوں میں یہ لفظ گکھڑ لکھا ہے، کیا آپ لوگ گکھڑ کہتے ہیں اور لکھتے ہیں،

حقیر سید ابو ظفر ندوی

کیا فی النسل ہونا، اور ہندو ہونا، دو متضاد باتیں ہیں، آپ فرماتے ہیں، کیا فی النسل ہونے کی تائید کسی تاریخ سے نہیں ہوتی، تو اس کی تردید بھی نہیں ہوتی، اب جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گکھڑ سلطان محمود کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے، اور ان کے درباری مورخ دوئی چند نے ان کا کیا فی النسل ہونا بیان کیا، جو اس نے عمراور سن گکھڑوں سے سنا ہو گا، جسکو وہ اپنی بزرگوں سے نسلاً بعد نسل سننے چلے آئے تھے، اس کو اسکو سمجھنا سننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، خصوصاً جب اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملتا، تو پھر اس کے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے، خاکسار کے ایک عریضہ کے جواب میں مولانا ابو ظفر صاحب نے معارف نمبر ۲۹ میں جو مقالہ تحریر کیا تھا، اس میں ایک جگہ اچیر کے خط پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

میرے دوست جناب ائم خان صاحب ایک فقرہ لکھا ہے کہ اسولی کا خاستہ بھی محمود کے ہمراہ

کے مورخ کی روایت کی کوئی حقیقت نہیں:

اگر اس قسم کے اصول صحیح تسلیم کر لئے جائیں تو پھر تاریخ طبری، کمال، ابن خلدون، طبقات نامری تاریخ الفی، بدایونی، آئین اکبری، ان میں سے کوئی معتبر نہ رہے گی، اس لئے یہ اصول صحیح نہیں، کہ مدت کے بعد مورخ کی تاریخ لکھی جائے، اس کی روایت صحیح تسلیم کی جائے کہ اس کا ماخذ کیا ہے، اور وہ صحیح مستند، قریب الہد یا شاہ معنی ہے، یا نہیں، اور پھر اس کے معاصر یا قریب الہد مورخ اس کے مؤید ہیں یا نہیں،

اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل خطا جو ناچیز نے ادارہ کی معرفت مولانا ابوظفر صاحب کو تحریر کیا تھا، اس کی نقل تحریر کر دی جائے جو حسب ذیل ہے،

مکرم زاد اظہار غم۔
السلام علیکم،

مؤرخ جبرہ معارف جولائی و اگست ۱۹۳۷ء میں کے گزشتہ نامہ المعروف گکھڑ نامہ پر مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے ایک تنقیدی مقالہ تحریر کیا، میں اس تنقیدی مقالہ پر کچھ لکھنا چاہتا تھا، احباب بھی امر کرتے ہیں، کہ اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیے، کیونکہ اس مقالہ نے چند غلط فہمیوں کا اور اضافہ کر دیا ہے، اگرچہ وہ بہت مقالہ ایک فاضل مجاہد ہیں اور ایک گکھڑ کی فرمائش پر گکھڑ نامہ کا اردو ترجمہ اور اس پر ایک تنقیدی مضمون معارف میں شائع کیا ہے۔

لیکن کردہ بات زمانہ نے اب تک اس کی فرصت نہ دی، انشاء اللہ آئندہ بھی اس پر گفتگو کی جائیگی مولانا موصوف نے اپنے مقالہ میں جو انہ فرشتہ تحریر کیا ہے، کہ گکھڑوں نے معمولی فوج سے مقابلہ کیا، اور تین چار ہزار مسلمان شہید ہوئے، کیا واقعی گکھڑوں نے محمود کی فوج سے مقابلہ کیا، تھا، فرشتہ کا مطبوعہ نسخہ بہت غلط چھپا ہے، اس کی ضرورت روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی، اصولی لحاظ سے بھی محمود کے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت قابل استناد نہیں ہو سکتی، تب تب ہو کہ مولانا جیسے وسیع النظر مورخ نے محمود کی معاصر اور قریب الہد مورخین کی مستند تاریخوں کو نظر انداز کر کے فرشتہ کو کیوں ترجیح دی، اس لئے یہ روایت بالکل

بے بنیاد ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، گکھڑ قوم محمود کی ہمراہی میں ہندوستان آئی، اس لئے ان کا ذکر ہمیشہ ہی ابن اثیر، طبقات نامری، تاریخ الفی، طبقات اکبری، بدایونی، الغرض کسی مستند تاریخ کے حوالہ سے تحریر کیا جائے کہ معمولی فوج سے لڑائی کھو گکھڑوں نے کی تھی، یا گکھڑوں نے، امید وثیق ہے کہ آئندہ معارف میں اس پر مفصل مقالہ مستند حوالہ جات شائع فرما کر مضمون فرما دیں گے تاکہ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے،

اب ناظرین خود ہی فیصلہ کر لیں کہ میرا یہ عرض کرنا، کس قدر صحیح تھا کہ معمولی لحاظ سے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت کی کوئی حقیقت نہیں، جو اس اصول کی دعوت سید صاحب نے دی تھی، خاکسار بھی اسی کی طرف ان کی توجہ منطقت کرائی تھی، مگر انھوں نے خاکسار کے عریضہ کو درخور اعتناء نہ سمجھا، پھر اسی مقالہ پر ایک جگہ آپ فرماتے ہیں کہ

میرے مکرم دوست نے یہ بھی لکھا ہے کہ گکھڑ محمود کی میت میں وارد ہند ہوئے لیکن کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذرا کہ یہ قوم محمود کے ساتھ ہندوستان آئی، سوائے آئین اکبری کی ایک شاذ روایت کے جس کی کسی تاریخ سے تائید نہیں ہوتی، اور بقول آپ کے چھ سو برس بعد کے مورخ کی روایت کس طرح صحیح تسلیم کی جائے؟

اب اس پر سیر حاصل تبصرہ ہو چکا ہو، فرید اتشہاد کی ضرورت باقی نہیں رہی،

سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت پر خاکسار کے استفسار پر
گکھڑ نامہ میں واقعی سلطان شہاب الدین
غوری کی شہادت کا ذکر کیا ہے؟
جو فاضلانہ مقالہ مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی کا معارف
جون ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا، اس میں موصوف نے قوم گکھڑ کو

سلطان کے قتل سے بے تعلق قرار دیا تھا، اور قاتل کھو گکھڑوں اور فرقتہ اسماعیلیہ کی سازش کا نتیجہ قرار دیا تھا، اگرچہ اس پر مغز متاثر میں کسی شک و شبہ اور ترہیم اور اضافہ کی مطلق گنجائش نہ تھی، لیکن مولانا سید ابوظفر صاحب نے معارف اگست ۱۹۳۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے سلسلہ میں اس بات کو تسلیم کیا

کہ فرشتہ کی منفرد روایت سے اور تمام مورخین متفق ہیں کہ یہ کام گھوڑوں نے کیا، اور فرشتہ دکن میں مقیم سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے گھوڑوں اور گھوڑوں میں فرق نہ کر سکا، اس کے برخلاف ہایونی نے دونوں قوموں کو الگ کر کے تحریر کیا ہے، پھر آپ لکھتے ہیں کہ کتابت کی غلطیاں بھی غلط فہمی کے لئے معاون ہوتی ہیں لیکن طباعت سے قبل جو نسخے اُس وقت تھے، ان میں بھی ان دونوں قوموں کی تفریق نہ تھی، اور اس تاریخ گھڑوں کے مؤلف نے بھی اس کو گھوڑوں کی بجائے گھڑی پڑھا، حالانکہ وہ فرشتہ سے قریب تر زمانہ یعنی ۱۱۳۷ء کے عہد میں تھا، اسی اگست کے پرچہ میں ایک جگہ گھوڑوں کے اسلام کے عنوان کے تحت مولانا نے تحریر کیا ہے کہ

غالباً اس کے عہد تک زبانی روایت ہی تھی کہ سلطان کو گھوڑوں نے شہید کیا لیکن مؤلف

کو خود اس کا یقین نہیں ہے، اسی لئے اُس نے آخر میں دُللہ اعلیٰ با الصواب کا اعجاز کر دیا

اسی مضمون میں مولانا نے فرشتہ کی تاریخ تا یوسف ۱۱۱۵ء تحریر کی ہے، جو درست نہیں ہے

مولانا سید احمد اللہ صاحب قادری حیدر آباد دکن نے ایک مقالہ مطبوعہ معارف جنوری ۱۹۳۶ء فرشتہ کا عہد

تصنیف میں فرشتہ کے اقتباسات سے ثابت کیا ہے کہ تاریخ فرشتہ کی تا یوسف ۱۱۱۵ء تک جاری رہی، بلکہ

مکمل ہے کہ اُس کے بعد بھی جاری رہی ہو جس سے ہم لاطم ہیں، ہمارے فاضل دوست کو یہاں سخت

غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، اسے زادہ دوئی چند نے اپنی کتاب لیکچر نامہ واقعی ۱۱۳۷ء میں تصنیف کی

تھی، اس میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کے قتل کا کوئی تذکرہ نہیں، اس کے بعد اس کے لڑکے رائے

زادہ برج ناتھ نے سلطان مکرم خان کے حکم سے تاریخ وجہ تسمیہ دیہات دان گلی و پھر الہ ۱۱۳۷ء میں

تحریر کی جو نہایت قیمتی اور پرازد معلومات کا کتاب ہے، اس میں موضع دھمک کا بھی جہان سلطان کی

شہادت بیان کی جاتی ہے، ذکر ہے لیکن اُس نے بھی قتل کا مطلق ذکر تک نہیں کیا، ایک اور کتاب تاریخ

دھمیا لان اسی خانوادہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص رائے زادہ بودھال ولد رائے زادہ موتی چند نے

۱۱۳۷ء میں تصنیف کی ہے، یہ کتاب قوم دھمیا لان کے مورث اعلیٰ اور بانی موضع دھمک کی تاریخ ہی

اس میں بھی سلطان کی شہادت کا کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ رائے زادہ رتن چند نے جو رائے زادہ دوئی

چند کا پوتا تھا، سلطان کے قتل کی وہ روایت بیان کی ہے جس کا تذکرہ میرے محترم دوست نے کیا

رائے زادہ رتن چند نے اپنی کتاب اور رائے زادہ موتی چند کی کتاب میں غلطی کر دیا ہے، جس سے مولانا

کو غلط فہمی پیدا ہوئی لازمی تھی، جن لوگوں نے رائے زادہ دوئی چند کی اصل کتاب دیکھی ہے، وہ اُسے

بخوبی جانتے ہیں، خاکسار کے پاس دونوں کے نسخے موجود ہیں، رائے زادہ رتن چند انگریزی عہد تک

اپنی تاریخ کی تکمیل کرتا رہا ہے، جس کو سید ابو ظفر صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ رائے زادہ

رتن چند نے تاریخ فرشتہ کا وہی مطبوعہ نسخہ جس میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں، دیکھا تھا، اس لئے

اُس نے سلطان شہاب الدین کے قتل کے متعلق اسی کا اقتباس اپنی تاریخ میں درج کر دیا، اور اسی پر قبول

سید صاحب اپنے عدم اعتماد کا اظہار بھی کر دیا، اگر فرشتہ کے مطبوعہ نسخہ سے پہلے اس واقعہ کی کوئی ذرا بھر

بھی اصلیت ہوتی، تو رتن چند کے پیشرو بھی اس کا ذکر اپنی تصانیف میں کرتے، کیونکہ بعض وجوہ سے ان

کا بیان کرنا بھی ضروری تھا، لیکن انھوں نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، جس سے اس بے سرو پا پانہ

کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے،

امید ہے کہ میری ان تصریحات کی روشنی میں جناب سید صاحب کو یقین ہو گیا ہو گا کہ فرشتہ کے مطبوعہ

نسخہ کی غلط طباعت و اشاعت ہی سے تاریخی دنیا میں غلط فہمی پیدا ہوئی، اور جو تاریخین اُس کے بعد لکھی

گئیں، انھوں نے اسی کو مانہ قرار دیا، بالخصوص انگریزی مورخین، لیکن ڈل میر کے نام سن وغیرہ

اس غلط فہمی کا شکار ہوئے، اور جن انگریز یا دوسرے مورخین نے فرشتہ کی تاریخ کی اشاعت سے پہلے

اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے، اس کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے، اتنے دلائل کے بعد اس مسئلہ پر مزید خامہ فرسائی بے کار ہے، در نہ میرے پاس اس ضمن میں کافی

مواد موجود ہے کہ دو آبہ سندھ ساگر پر عرصہ دراز تک قوم کھوکھر حکمرانی کرتی رہی، جس کا عمل و فعل سلطان محمود سے بھی بہت پہلے تھا، اس دو آبہ کا مشہور شہر آسونی کوٹ قوم کھوکھر کا دار الحکومت تھا، جو بابل النہر کہلاتا تھا، موجودہ موضع دھمک تحصیل جہلم میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کی شہادت بھی مشتبہ معلوم ہوتی ہے، اور بعض حقائق تاریخی کے خلاف ہوا کا سارنے اس مسئلہ کی بڑی تحقیق کی جو اگر زندگی نے وفا کی، تو انشا اللہ اس مفصل روشنی ڈالی جائے گی،

ایک عرصہ تک میں بھی اسی دھمک میں سلطان کی شہادت کا قائل تھا، اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دھمک ہوا کوئی دوسرا مقام اس محل مسئلہ میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اسے زادہ برج نامہ تھانے اسے زادہ دونی چند کے لیکو ہر نامہ کا تہہ نہیں لکھا، بلکہ یہ ایک مستقل تصنیف ہے جس کا موضوع جدا ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر نامدار ہے، مگر اب نایاب ہے، یہ صحیح ہے کہ اسے زادہ تہہ نے لیکو ہر نامہ اسے زادہ دونی چند کا بھی تہہ لکھا ہے، لیکن اس کے بعض نسخے بلا تہہ کے بھی ہیں، جو بعض علم دوست گھرانوں میں موجود ہیں، میرے پاس جو نسخہ ہے، وہ میرے فاضل دوست راجہ کفایت علی خان صاحب پنوار آت چند وٹ ضلع جہلم کے نسخہ کی نقل ہے، جس کو ان کے پردادا چوہدری شاہ بازمرد مہتمم سردار جہلم سنگھ اناری نے میان ابراہیم صاحب ساکن موضع کینٹ تاج خان سے ۳۳۱ھ میں نقل کرایا تھا، یہ اغلباً خاندان گلیانہ سے نقل کیا گیا ہوگا،

اس میں علاوہ پٹھان کی وجہ تسمیہ اور اس کے جملہ دیہاتوں کے حالات مع وجہ تسمیہ کے بیان کے ہیں، لیکو ہر نامہ مؤلف مرتن چند تو بہت آدمیوں کے پاس ہے، مگر لیکو ہر نامہ دونی چند کے نسخے کیاب ہیں، اور تاریخ وجہ تسمیہ دیہات مؤلف اسے زادہ برج نامہ تو نایاب بلکہ ناپید ہے، مگر اس کا ایک نسخہ خاکسار کے پاس موجود ہے،

یہ اصل چند گھر تھا اور واقعی
عمداً تہہ اور بین میں
بیب رکھنے والے گھر موجود تھا

محترم سید بو ظفر صاحب معارف مارچ ۱۹۳۵ء میں رقمطراز ہیں کہ میری کتاب لیکو ہر نامہ مکمل ہو چکی ہے، تقریباً اٹھارہ ہزار کتابوں سے حاشیہ میں اصل کتاب کی تائید و تردید کی ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ تہہ اور بین کے عہد تک گھروں میں ہندو مذہب رکھنے والے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک کا نام گل چند تھا، بادیونی میں بھی اس کے حوالے ملتے ہیں، یہاں بھی میرے فاضل دوست کو غلط فہمی پیدا ہوئی، گل چند کھوکھر تھا نہ گھر تھا، اس کی تردید سے پہلے آپ کے اس استفسار کے اس حوالہ پر بیان نظر ڈال لی جائے، جس میں آپ نے فرشتہ کی اس غلط فہمی یا غلط بیانی کا ذکر کیا ہے کہ اس نے سلطان کے قانون میں کھوکھروں کی بجائے گھروں کا نام لیا ہے، تاکہ فرشتہ کے بیان سے سلطان کے قانون میں ایک نئی جماعت کے نام کا اضافہ نہ ہو جائے، یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تاریخ فرشتہ کا مطلوبہ نسخہ بہت غلط چھپا ہے، اس نے اس میں کھوکھر اور گھروں میں امتیاز نہیں رکھا ہے، مختلف مقاموں میں جہاں گھروں کا نام چھپا ہے، لکھ چھپا ہے، مثلاً ص ۲۴۱ میں سلطان آدم کو گھر کے بجائے لکھ لکھا گیا ہے، اسی طرح ص ۲۲، میں جہاں ملک چند سردار کھوکھر کی بغاوت کا ذکر ہے لکھ چھپ گیا ہے،

اسی طرح ص ۱۳۴ میں جہاں جہرت کھوکھر کے لاہور کے صوبہ دار کو مارنے کا ذکر ہے، وہاں بھی لکھ لکھا ہے، اس کے برخلاف بادیونی وغیرہ میں کھوکھر اور گھر کے فرق کا لحاظ ہر جگہ موجود ہے، مثلاً حسرت کھوکھر ص ۲۸۹ گل چند کھوکھر ص ۲۳۱ اور گھروں کو لکھ لکھا گیا ہے، جیسے سلطان آدم لکھ لکھا ہے، ص ۲۹۱ برسر لکھ لکھا ہے، ص ۳۸۸، اول پناہ لکھ لکھا ہے، ص ۳۸۲ وغیرہ، یہ سمجھنا کہ بادیونی نے ان دونوں قوموں میں امتیاز کیا ہے، اور تاریخ فرشتہ نے جو چند سال بعد مکمل ہو چکی دونوں کو خلاصہ ملا کر دیا ہے، قیاس سے دور ہے، اس لئے قیاس ہے کہ طباعت کے وقت کتاب کے قلم سے سو ہوا، اور وہ کھوکھر اور لکھ لکھا میں امتیاز نہ رکھ سکا، اور اس ایک غلطی سے ایک قوم کا پورا بار گنا

دوسری قوم کے سر آگیا، اس لئے جن لوگوں کے متعلق سید صاحب کا گمان ہو سکتا ہے کہ وہ گھڑو ہیں اور ہندو مذہب رکھتے تھے، وہ تمام ہی گھو گھڑو ہیں، ان میں سے کوئی بھی گھڑو نہیں ہے، گھڑو سلطان محمود کے ہمراہ بحیثیت مسلمان ہندوستان وارد ہوئے، لہذا یہاں تک کہ غلط فہمی میں ان کا کوئی آدمی ہندو نہیں تھا،

لفظ گھڑو کی حقیقت | سید ابو ظفر صاحب نے اپنے مضامین جولائی، اگست ۱۹۴۷ء اور مارچ ۱۹۴۹ء میں لفظ گھڑو کے بجائے جا بجا اُس کو گھڑو تحریر کیا ہے، جو بالکل غلط ہے، لفظ گھڑو درست ہے، موصوف نے جو مکتوب برادر امجد سردار علی خان صاحب آف ملٹ کو تحریر کیا تھا، اُس میں بھی انھوں نے اُن سے اپنی قوم کے نام کا امداد دریافت کیا تھا، رد مزہ کی بول چال اور تحریر میں گھڑو کی بجائے گھڑو ہی بولا اور لکھا جاتا ہے، اس میں عوام تو درکنار اہل نظر تک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے اس کے امداد میں احتیاط کی ضرورت ہے،

گھڑو کے اسلام قبول کرنے | معارف اگست ۱۹۴۷ء میں مولانا سید ابو ظفر صاحب نے گھڑو کے اسلام قبول کرنے کی روایت فرشتہ کے حوالہ سے بیان کی ہے، جسے پڑھ کر حیرت منہ ہوا، کاش وہ اس بے سرو پا داستان کو لکھنے سے پہلے اس پر غور کر لیتے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ کداسی پرچہ کے ص ۱۲۱ کے حاشیہ پر یہ تحریر کیا ہے کہ

”قیم ہندو قوم میں یہ رسم عام تھی، ہندوستان کا ہر تواریخ اس کو جانتا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ جنت میں آج بھی اُس کا رواج بعض جگہ موجود ہے، اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، کیونکہ گھڑو جنت سے آئے، جہاں اس کا عام رواج تھا جیسا کہ تاریخوں میں مذکور ہے“

شاید اس تحریر سے اُن کو اپنے رفیق ہمدرد راہ گزدار خان کے ساتھ ہمدردی مقصود ہو کہ اُن کو ایک ایسی تبدیلی جانی ہو جو ہمیشہ قائم رہے، انھیں افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے دوست کی

ذاتی تاریخ کا دیباچہ خوب ہی لکھا ہے اس کو لکھتے وقت انھوں نے یہ نہ سوچا کہ اس سے اس غیور اور بہادر قوم کے ہزار ہا افراد کے جذبات کو سخت ٹھیس لگے گی، اور وہی طرز عمل اختیار کیا، جو بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم میں بدلنے والی لکیر کے ساتھ کیا تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بیان کی حقیقت بھی ہے، یا محض گپ ہے، اور فرشتہ کی تفسیر طبع کی ایجاد ہے، اس سے پیشتر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ سلطان محمود کے ساتھ گھڑو ہندوستان میں آئے، اور سلطان شہاب الدین کو گھو گھڑو نے قتل کیا تھا، اس کے بعد اس بیان کی کوئی حقیقت باقی

نہیں رہتی کہ گھڑو سلطان شہاب الدین کے عہد میں مسلمان ہوئے، لطف یہ ہے کہ یہاں بھی وہ اپنے تمام پیشروں سے منفرد ہے، اور کسی دوسری تاریخ سے اس نیاور میں گھڑو داستان کی تائید نہیں ہوتی، یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ جس زمانہ کی تاریخ لکھی جا رہی ہے، اس زمانہ یا اُس کے قریب العہد تواریخوں نے تو اس واقعہ کو نہیں لکھا، اور طویل عرصہ گزر جانے کے بعد ایک مورخ بلا سند اس کو بیان کرتا ہے ایسی حالت میں یہ بیان کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے، جب تک ہم عصر یا قریب العہد تواریخ کے بیان سے اس کی تائید نہ ہو، وہی ثابت کی داستان تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر گھڑو جنت سے ہندوستان آئے

نئے، تو یقیناً ان میں یہ نقائص اور خرابیاں پائی جاتی تھیں، مگر اپنے محترم دوست کی واقفیت کے لئے یہ بتادینا ضروری ہے کہ اس قوم میں قدیم الایام سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ کوئی دوسری قوم کے معزز سے معزز شخص کو بھی اپنی لڑکی نہیں دیتے، بلکہ اس بارہ میں اتنی سختی ہے کہ گھڑو کی مختلف گوتین دوسری گوت بن رشتہ نہیں کرتیں، مثلاً سکندراں، گکیاں، فیروزاں، سارنگال، آدماں، ایک دوسرے میں شادی بیاہ نہیں کرتے، اگر کوئی شخص کسی مصلحت سے ایسا کرنا چاہے تو وہ کتنا ہی معزز ہو، اس کو برادری بڑی بڑی عہد شکنی سمجھتی ہے، بعض دفعہ تو ایسے مواقع پر خوریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ایسی غیور، خوددار، اور بہادر قوم پر ایسے الزامات عائد کرنا امر بجا ظلم ہے، اسی اگست کے پرچہ میں سید ابو ظفر صاحب نے بحوالہ فرشتہ گھڑو کے مسلمان ہونے کی روایت بیان کر کے اپنی رائے انکی تعداد لاکھ بتائی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

فرشتہ نے گھڑوں کے اسلام قبول کرنے کے حالات تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ شہاب الدین غوری اسی سال تیرہ کی طرف گیا، جو غزنہ اور پنجاب کے درمیان میں ہے اور وہاں کے لوگوں کو بھی نرمی اور نرمی سے اپنا فرمان بردار بنا کر اسلام میں داخل کیا اور ان دونوں قوموں کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی، اس میں تیرہ کا علاقہ پہاڑی ہے، اس میں اس قدر سرسبز اور شادابی نہیں جس قدر وہ آب و ہوا، پوٹھوہار میں ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہاں کی آبادی تیرہ سے زیادہ ہو، لیکن بالفرض نصرت ہی مان لیں تب بھی غوریوں کے عہد میں وہ دو لاکھ کی تعداد شمار میں آتی ہو۔

یہ مسئلہ کا ذکر ہے، حالانکہ اب یعنی مسلمانوں میں بھی ان کی تعداد ہزاروں سے متجا وز نہیں ہے جس پر بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ گھڑ نہ تھے،

حیرت ہے کہ ایک طرف تو سید صاحب نے خراسانی نسل کے لوگوں کو جنہیں افراسیاب نے جلا وطن کیا تھا، گھڑ بتاتے ہیں، اور دوسری طرف فرشتہ کو یہودہ اور من گھڑت فسانہ کو صحیح مانتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں تضاد ہے، خراسانی نسل کے لوگ کسی بیگانہ سے پیوند نہیں کرتے، اور مذہباً بت پرست تھے، اور فرشتہ نے سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں جس قوم کے مسلمان ہونے کی روایت بیان کی ہے، اس کے متعلق لکھا ہے کہ کسی خاص مذہب کا پابند نہ تھی، لڑکیاں فروخت کرتی تھیں وغیرہ، کیا ان دونوں روایتوں میں کسی قسم کی نسبت ہو سکتی ہے ان تصریحات سے حقیقت حال پوری واضح ہو گئی، اس کے بعد مزید دلائل و شواہد کی ضرورت نہیں ہے، تب تب بن گھڑاگر رہے ہیں، تو بحیثیت حکمران کے، اور ایسی یہودہ رسم کسی حکمران غیر اور جو قوم میں نہیں پائی جاسکتی۔

آخر میں ایک اور بات عرض کر دیتا ضروری ہے اور وہ یہ کہ فرشتہ نے جو داستان بیان کی ہے اس کی بحث اس کے لیے نہیں کی گئی، اور اگر ہو سکتی ہو تو وہی جو عہد شہاب الدین میں مسلمان ہوئی، اور یہ قوم کھوکھڑے، لیکن یہ نہایت بہادر اور غیور قوم تھی، کسی بہادر اور نامور قوم

کو اس قسم کے الزامات سے متم کرنا کس قدر ظلم ہے، تب تب بن آباد ہونے سے ان میں ان برائیوں کا پیدا ہونا لازمی نہیں ہے، خصوصاً جب کہ مولانا یہ بھی مانتے ہیں کہ صرف بعض جگہ اس کا رواج تھا، گویا تمام بن بنین تھا، پھر یہ بھی تحقیقی طور پر معلوم نہیں کہ کس زمانہ میں یہ رسم تھی، لیکن بالفرض اگر کسی زمانہ میں بھی تو یہ مسلم ہے کہ ایک ہی شہر یا ملک میں نیک معاش اور بد معاش ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں، انہماک فرشتہ سیرت بن سکتا ہے اور نہ تمام ملک کے باشندے بد سیرت ہو سکتے ہیں،

راٹم نے اس مضمون میں حتی الامکان سید صاحب کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے تاہم اگر کوئی فقرہ ان کے خلاف طبع قلم سے نکل گیا ہو تو وہ اس کے لئے معذرت خواہ ہے۔

شایعین کو موصوف کے ترجمہ کے گوہر نامہ کی اشاعت کا بڑا انتظار ہے اس لئے امید ہے کہ وہ جلد اس کو شایع کرنے کی کوشش کریں گے، بہتر ہوتا کہ گھڑوں کے متعلق فارسی اور انگریزی تاریخوں میں جو حالات ملتے ہیں ان کا ترجمہ بھی بطور ضمیمہ کے اس کتاب کے ساتھ شایع کر دیا جاتا، اس سے اس کی افادہ جہت بہت بڑھ جائے گی اور گھڑوں کے متعلق کل معلومات ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔

تصوفِ عالم

اسلامی تصوف کا عطر، قہ مار صوفیہ کا لب لباب، اور ان کی تصانیف پر تبصرہ

قیمت ۱- ع

(مرتبہ مولانا عبدالمجید صاحب دریا بادی)

منیجر

جرمنی میں اسلامی علوم

کے
متعلق کارگزاری کی پانچ سالہ (۱۹۴۵ء) روداد
متوجہ

جناب محمد معز الدین صاحب علوی بی کام

جرمنی مستشرق ڈاکٹر ایشیز پر و فیسر عربی یونیورسٹی آج سے پندرہ سو سال پیشتر تین سال تک
سلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں، انھوں نے ۱۹۵۱ء کے رسالہ اسلامک لٹریچر ایڈ
مین مذکورہ بالا عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، یہ مضمون بہت مفید خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو اسلامی علوم سے
دلچسپی رکھتے ہیں، بہت دلچسپ ہے، اور اہل مشرق کے لئے اسکی تفصیلات سبق آموز ہیں، کیونکہ وہ اپنے قابل فخر
کارناموں سے نہ محض یہ کہ دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ ان سے بے خبر بھی ہیں، شاید اہل جرمنی کی کارگزاری ہمارے
ملک کے لوگوں کے لئے باعث شوق ہو، اس لئے ہم محترم مولانا سید محمد بدیع الدین صاحب علوی نے مجھے
اس مضمون کے ترجمہ کا حکم دیا، ان کے ارشاد کی تعمیل میں ناظرین معارف کے لئے اس کا ترجمہ اردو میں
پیش کیا جاتا ہے (محمد معز الدین علوی بی کام)

دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کی اقتصادی مشکلات نے جرمنی میں تحقیقی کام کو بہت کچھ روک
دیا تھا، تاہم اس ناسازگار زمانے میں بھی علماء نے اپنے پرانے تحقیقی کاموں کو جاری رکھا، اور مستشرقین کی ایک
نئی پود بھی وجود میں آئی، اگر مالی مشکلات کی وجہ سے طباعت کا کام کم ہو گیا تھا، اور بہت سے ناشر مشرقی

موقوفات کی کتابوں کا کام صرف اس وجہ سے نہیں کرتے تھے کہ اس کے جاننے والے کم ہیں، چنانچہ بہت
مسودات جو طویل اور گہری تحقیقات کا نتیجہ تھے، ہمیں چھپ سکے، ان دشوار یوں کے باوجود بہت سی کتابیں
اس تحقیقی کام کی شہادت دیتی ہیں، جو اس دور میں سرانجام پائیں

ہم اس مقالے کی ابتداء رسالہ جات کے بیان سے کرتے ہیں، مشرق کے متعلق بہت سے رسالے
جرمنی میں شائع ہو رہے ہیں، چنانچہ مجلہ جرمن انڈیکس سوسائٹی پھر سے جاری ہو گیا ہے، اور اس کی سہ ماہی
ہر ایک کی ایک جلد چھاپی گئی ہے، اور سوسائٹی کے صد سالہ جشن کے موقع پر چار سو صفحات کی ایک جلد حال میں
دنی ہے جس میں بہت سے اہم مقالے شامل ہیں، جن کی تفصیل دشوار ہے، اسلامی موقوفات سے دلچسپی
رکھنے والے اس خبر سے خوش ہوں گے کہ رسالہ ڈر اسلام جو پروفیسر بکر نے جاری کیا تھا، اب پروفیسر پور
ہبرگ یونیورسٹی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے، اس کے تازہ ترین نمبروں میں اسلام کے متعلق تاریخی اور
تہذیبی معیاری مضامین شائع ہوئے ہیں، اور نئے رسالے اور جاری ہونے ہیں، ایک دنیا کے مشرق میں
اسلامی موقوفات کے علاوہ زبان ادب اور قدیم شوریوں کے متعلقہ امور پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں، اور
رسالہ فنون شرق ہے، اس کے ایڈیٹر برلن یونیورسٹی کے پروفیسر کوئٹل ہیں، یہ رسالہ اسلامی فنون لطیفہ اور فن
تعمیر پر خاص طور سے مضامین شائع کرتا ہے، ایشیا کے فنون لطیفہ پر بھی اس میں مضامین نکلتے ہیں، اسٹریامین
دینا کا مجلہ تحقیقات متعلقہ مشرق پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے،

اب ہم ان مقالوں کا ذکر کرتے ہیں، جو اسلامی علوم سے متعلق ہیں، اور اس سلسلہ کو عربی سے شروع
کرتے ہیں، پروفیسر پارٹ جو یونیورسٹی برلن پروفیسر لٹمان کے جانشین ہیں، قرآن شریف کے نئے ترجمے
میں مشغول ہیں، جن سے اصولوں اور طریقوں پر وہ ترجمہ کر رہے ہیں، اسکی تشریح کے لئے انھوں نے ایک
متن کتاب قرآنی تحقیقات کی تجدید کے نام سے لکھی ہے، اسمیلیون کی تفسیر فراج التیسرے صفحہ غیا، الدین
اسمیل ہیبتہ اللہ کے تین حصوں کو پروفیسر سترنٹن، ہبرگ یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، پروفیسر نوک

ہائے یونیورسٹی نے جو پیشتر ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہ چکے ہیں، حال میں ایک اصولی اور قابل فکر کتاب عرب کے نام سے شائع کی ہے، جس میں عربی ادب کے وسیع مطالعے کی بنیاد پر قدیم عربی کی ترقی کو بہت سحر سے انداز میں دکھایا ہے، برنٹن یونیورسٹی کے علماء نے ۱۹۴۵ء میں جو وفد شام بھیجے تھے، ان کے جمع کئے ہوئے مواد سے پروفیسر لٹمان نے ایک کتاب عربی کتبہ جات کے نام سے شائع کی ہے۔

اس دور میں تاریخ اسلام پر بھی کافی کام ہوا ہے، سامرا کے متعلق پروفیسر ہارز فیلڈ نے ایک نئی کتاب شہر سامرا کی تاریخ کے نام سے شائع کی ہے، جس میں انھوں نے صوبوں اور شہروں کے محل وقوع کو بیان کرتے ہوئے ان کے باشندوں اور خلفاء کی تاریخی تصویر پیش کی ہے، مشہور عالم پروفیسر ہارٹمن برلن یونیورسٹی نے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اسلام اس کے آغاز، بنیادی عقائد، اور ترقی پر نظر غائر ڈالی ہے اور ہرہ کے قدیم فاطمی خلفاء کی تاریخی تحقیق بھی خوبی سے کی ہے، پروفیسر پارٹ نے روحی دنیا پر اہل عرب کے حملوں کی تاریخ مختصر کر کی ہے، پروفیسر اسپولر نے عہد مغلیہ پر ایک تاریخی تبصرہ لکھا ہے، انھوں نے پروفیسر اسٹراٹھمن کے ساتھ مل کر ایک اور کتاب مذاہب کا مقابلہ بھی لکھی ہے جس میں سنی اور شیعہ مذہبوں کا خاکہ پیش کیا ہے، پروفیسر تاشن نے اپنی کتاب اسلامی تاریخ کا مواد میں سلطان اشراف نخل کے رسالہ فتوہ کا ترجمہ کیا ہے، اس رسالہ کا ذکر قلعندی کی صحیح الاغشی میں موجود ہے، پروفیسر جاکب نے مصطفیٰ کمال کی سفارت اناطولیہ کا جائزہ لیا ہے، اجماع سے مصطفیٰ کمال نے اپنی قومی تحریک شروع کی تھی، پروفیسر ایشپیر نے اپنی کتاب جرمن زبان میں مشرقی مضامین میں مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات کا ایک باب قائم کیا ہے، پروفیسر پارٹ نے اپنے کچھ اسلام اور یونانی علوم میں نہایت قابلیت کے ساتھ اسلام پر یونانی علوم کے اثر کو بیان کیے یہ بتایا ہے کہ اہل عرب نے معتزلہ کے ذریعہ یونانی تعلیم قبول کی، پروفیسر ہارٹمن نے اپنی کتاب اسلام اور قومیت اور پروفیسر روبرگ نے اپنی کتاب دنیا کے عرب میں موجود مسائل پر روشنی ڈالی ہے، جو خرا لہ کرنے عرب ریاستوں اور ان کی تازہ ترین سیاسی

نژاد کا ذکر کیا ہے، پروفیسر ہارٹمن نے مشرق ادنی کا تیل کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں تیل کے اقتصادی پہلوؤں پر بحث کی ہے، پروفیسر لٹمان نے ایک بیش بہا مجموعہ عربی متون کا شائع کیا ہے جس میں اسلامی اور مصری اشعار کے نمونے، درج کئے ہیں، انھوں نے ایک اور کتاب مصر میں اہل عرب کی جہاز پنک کی رسم پر شائع کی ہے، جو عورتوں میں رائج تھی، اور جس کے بعد گانا ہوتا تھا، عمومی شاعری کے دو تین بھی مع ترجمہ کے شائع کئے ہیں، ان میں ایک احمد البدوی کے عنوان سے ایک نظم ہے جو مصر کے مشہور صوفی احمد البدوی سے متعلق ہے، دوسری کا عنوان ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر دلعزیزی کے بھیس میں اس نظم میں دو سو بائیس اشعار ہیں، اس کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے، جرمن زبان میں ترجموں کے ذریعہ موجودہ عربی ادب عوام تک پہنچ گیا، ای محمود تیمور کی کتاب مختصر کہانیاں کا ترجمہ پروفیسر ایشپیر نے کیا ہے، ڈاکٹر ہانزیج نے اپنی کتاب صدائے عوام میں بھی محمود تیمور کی اسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے، عربوں کے اذال اور اشعار کے مجموعے ہائیں اور طاہر خمیرن نے مرتب کئے ہیں، پروفیسر لٹمان نے بدوی کہانیوں میں سے دو کہانیوں کا انتخاب کیا ہے، جو دنیا کے مشہور ادب میں شامل ہونے کے قابل ہیں،

بڑے اہتمام کے بعد جرمنی میں موجودہ عربی زبان کا ایک مبسوط لغت جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے ابھی حال میں شائع ہوا ہے، اس کے مرتب پروفیسر و ہرنے اخباروں، کتابوں، ریڈیو، اور متعدد مشرقین کی مدد سے اس کتاب کا مواد حاصل کیا ہے، ایک اور لغت کی کتاب پروفیسر میگل نے تالیف کی جو عربوں کے فنِ کیمیا کے متعلق ہے، یہ کتاب ان کی علم کیمیا کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے، اسی مصنف نے کیمیا پر عربوں کی تصانیف کے ان قلمی نسخوں کی دو فرسٹین تیار کی ہیں، جو برلن اور گوتھام ہیں، ڈاکٹر گاربرس نے کتاب کیمیا، الطرد والتسیدات کا ترجمہ اور شرح لکھ کر عربی عطر سازی، اور علم کیمیا کے متعلق ایک مفید کتاب کا اضافہ کیا ہے، یہ کتاب مشہور فلسفی الکندی کی تصنیف ہے، جرمن علماء نے ترکی زبان، ادب، اور تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے، جہاں تک اس کی طرف

کی تعلیم کا تعلق ہے، مبتدیوں اور ان لوگوں کے لئے جو ترکی زبان سیکھنا چاہتے ہیں، ہم پروفسور رول کی کتاب پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں، پیٹرس نے موجودہ ترکی کی ایک باقاعدہ صرف و نحو لکھی ہے جس میں قواعد سے زیادہ حوالہ جات ہیں، پروفسور گابن ہیرگ یونیورسٹی نے وسط ایشیا کے اسلام سے پہلے کے ترکی مسودات بہت خوبی کے ساتھ پیش کئے ہیں اور سنہ ادب کے کچھ ترجمے کئے ہیں، پروفسور اپینر نے ترکی کے سمجھنے والے قلم کی تاریخ شائع کرنے کے بعد اب دونوں بھی ترجمہ کر رہے ہیں، ایک کا نام قتل کا تاوان اور دوسرے کا توجہ کا گھر ہے، موجودہ ترکی کے طنز و تحریر کو دکھانے کے لئے ڈاکٹر شمل نے ڈاکٹر کیسلنگ کی مدد سے اس کا نمونہ جرمن زبان میں پیش کیا ہے، اور اس سلسلہ میں ترکوں کے مشہور ناول نویس یعقوب قادری کے ناول نور بابا کا ترجمہ ڈاکٹر شمل نے کیا ہے، ڈاکٹر کیسلنگ نے ان کی تصنیف برسر انجام کی تیار کردہ مختصر کتابوں کا جرمن میں ترجمہ کیا ہے۔

ترکی تاریخ کے سلسلہ میں پروفسور دودا نے موجودہ ترکی تاریخ کی ترقی کا حال اپنی کتاب موسومہ خلافت سے جمہوریت کی طرف میں بیان کیا ہے، اس میں انھوں نے خاص طور سے ترکوں کے غی و رجائات پر زیادہ توجہ دی ہے، پروفسور تاشن نے ترکی کی تاریخ جہان نامہ مصنفہ محمد تشری کا ایک نیا ایڈیشن تیار کیا ہے، جو لیپزگ کے مشرقین کی سوسائٹی کی جانب سے شائع ہونے والا ہے، پروفسور دودا نے ایک کتاب میں بقایوں پر عثمانیوں کے غلبہ کے سلسلہ میں اقتصادی اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے، فارسی علوم میں قدیم اور قرون وسطیٰ کو چھوڑ کر ہم صرف اسلامی دور کے مطبوعات کو بیان کرتے ہیں، حیات شیخ اسحاق الگارونی مصنفہ محمود بن عثمان کی ڈاکٹر فرڈینانڈ نے بھیجی ہے، ڈاکٹر شمل نے مثنوی مولانا روم کے استعاروں کو ترتیب دیا ہے، ڈاکٹر پران کے مقالے احوال شاہ اسماعیل نے دولت صفویہ کے سپہ سالار شاہ کی زندگی پر روشنی ڈالنے کے لئے نیا مواد فراہم کر دیا، فرڈینانڈ نے ایک کتاب ایران میں دولت لکھی ہے، جس میں ایرانی زندگی اور ایران کے ذرائع سے ایران کی سیاسی حالت کا مکمل نقشہ

پروفسور آڈمن کی کتاب ساسانیوں کے فنون اس موضوع پر ایک بیش قیمت اضافہ ہے، پروفسور ہنر کے مقالات جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، بہت اہم ہیں، ان کی تحقیقات نے قرون وسطیٰ کے اسلامی اقتصادیات کے متعلق بڑے بنیادی نتائج نکالے ہیں، انھوں نے اپنے ایک مقالہ قرون وسطیٰ میں مشرق وسطیٰ و مشرق ادنیٰ کے درمیان معاشرتی تعلقات میں ایک بنیادی پیش قدمی پیش کیا ہے، اور مندرجہ ذیل تحقیقاتوں کے ذریعہ اس موضوع کو پائیدار تکمیل تک پہنچانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

- ۱۔ قرون وسطیٰ میں اسلامی ممالک کے سرکاری خزانوں کا حساب و کتاب (Daraslam uol. 29)
 - ۲۔ نیرہویں دسواویں صدی میں مشرقی اناطولیہ کا قاعدہ لگان (مجید جرمن اورٹیل سوسائٹی جلد نمبر ۱۰۰)
 - ۳۔ قرون وسطیٰ میں مشرق قریب کے قواعد لگان (Bullekin uol. 13. v. 16. 52)
- پروفسور آڈمن حسن (Uzum Hasan) جو عثمانیوں کے مقابلہ میں یرپ کی طاقتوں کا پندرہویں صدی میں دوست تھا، اس کی تاریخ ایران میں قومی حکومت کا ترجمہ بھی پروفسور ہنر نے جرمن زبان میں کیا ہے، جو ۱۳۳۷ء میں برلن سے شائع ہوا ہے، یہ کتاب نہایت اہم ہے، ہم نے اس مضمون میں سامی زبانوں ادبیات، قدیم مشرق اور ہندوستان کے علوم و فنون پر جو تحقیقات اس دوران میں ہوئی ہے، ان کو نہیں لکھا، اس پر بھی کافی کام ہوا ہے، جو لوگ جرمن اور آسٹریا زبان کی مشرقی علوم کی کتابوں کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو Literature an - The oriental in Germany and

ہندوستانی خلیہ خوش وقت و سپاسگزار خواہم شد بندہ المانی ہستم و در دانش گاہ ہال درس زبانہاے
فارسی و عربی و ترکی و ہندی قدیم می کنم آن زبانہا بر اے اروپیان خلیہ مشکل است خصوصاً زبان عربی و فارسی
مشغول ترجمہ یک کتاب فارسی ہستم یعنی خلاصۃ المناقب کہ از قلم شیخ سید علی ہمدانی است و او در خانقا
خٹان در ولایت بدخشان در عصر ہستم ہجری زندگانی کرد

درین دانشگاہ دو دانشجوے ایرانی ہست کہ درس شیمیائی می کنند گاہ گاہ با ایشان ملاقات صحبت
زبان فارسی می کنم یک از ایشان خانم سولیس رازن گرفته است
پیش جنگ بندہ با فلان جوان لاہوری مکاتبہ کردم ہمیش اندر جیت لال رکھی بود و ازان
اہم قیاس کردم کہ ہندو بود

اگر اجازہ بہ ہید از شما چند سوال در مورد احوال دولت ہندوستان می پرسم اذان جیت کہ بندہ
تجسس زبانہا می کنم خصوصاً این مسئلہ جالب توجہ من است کہ کدام زبانہا در آن دولت نواستعمال می شود
آیا زبان انگلیزی بیسیوگی در ادارات حکومت و پست و در دانش گاہ و مدارس اولی استعمال می گردد؟
آیا زبان ہندوستانی دائماً بحروف ناگری نوشتہ می شود و یا بحروف عربی و یا اردبی؟ آیا در دانشگاہ ہا
زبانہاے اردبی غیر زبان انگلیزی تدریس می شود؟ از جواب شما منتظر ہستم
با تقدیم احترامات

یوہان کارل ٹوفل

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم فخری کی تاریخ التشریح الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل اور ایسا
نمبر ہے جس سے جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے اہمیت ہے

پتھر

مکتوب جرمنی

"الحمد للہ کہ دارالمصنفین کی آواز ہندوستان کے باہر برابر قائم ہے اور اسلامی و مشرقی علوم کے علما
و محققین ان مسائل کے متعلق وقتاً فوقتاً اس کی جانب رجوع کرتے رہتے ہیں پانچ گزشتہ دسمبر میں ایک
جرمن اسکالرنے ہندوستان کی زبان کے متعلق بعض سوالات پوچھے ہیں ان کو ناظرین معارف کے
دیکھنے کے لئے شائع کیا جاتا ہے"

"م"

۲۶ نومبر، المانیہ
Gokann Karl Teufel

Muhlenrain 30a

Weil am Rhein.

الی آقا فی شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین عظیم گڈہ یوپی، ہندوستان

آقاے محترم :-

آؤں شرفیاد از طرف و کترم، حمید اللہ کہ حالاً در پائے تخت فرانسیہ منزل می کند دریافت کردم
علت اینکه پنجاب عالی زحمت دادہ، و این نامہ را نوشتہ ام اینست کہ از شما سوال می کنم کہ آیا شما میل دارید با
فانی زبان فارسی و بارہ امور دولت جدید ہندوستان مکاتبہ کنید، فعلاً معرفت آن دولت نو درین کشور
کمست و محال است کہ در روزنامہ ہا مرتب در مورد آن مملکت اخبار بخوانیم ازین جہت از مکاتبہ با شخص

بَابُ التَّقْرِيزِ وَالْحِجَابِ

تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اول)

از

سید مباح الدین عبدالرحمن ایم ۱۰۷

مذکورہ بالا کتاب اردو زبان کے مشہور و معروف اہل قلم جناب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی تصنیف ہے جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے شائع کیا ہے، یہ تاریخ غالباً کالج کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں بیٹھ کر جو اہل قلم بھارت و پاکستان کی تاریخ مرتب کرے گا، اس کی نوعیت بھارت میں بیٹھ کر لکھنے والے کی تاریخ سے بالکل علیحدہ ہوگی، اسی طرح بھارت کے رہنے والے اہل قلم اہل پاکستان کی لکھی ہوئی تاریخوں پر تنقید و تبصرہ کرتے وقت کچھ خاص خاص ذمہ داریاں محسوس کرتے ہیں لیکن ہم کو اپنی اس خوشی کے اظہار کرنے میں تاثر نہیں کہ زیر نظر کتاب میں کوئی ایسی تنازعہ فیہ بات نہیں جس سے کوئی تلخ یا ناخوشگوار بحث پیدا ہوتی ہو، دراصل یہ کتاب سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی اس تاریخ کا ترقی یافتہ ڈیٹیشن ہے، جو انھوں نے تیس برس پہلے حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے انگریجیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی تھی، اسی نے اس میں بدلے ہوئے حالات و جذبات کے اثرات نہیں پائے جاتے لیکن انھوں نے اس زیر نظر کتاب کی جو ترتیب دی ہے، اس میں بہت سے

مفید اور ضروری معلومات کا اضافہ کیا ہے جس سے یہ کتاب ویسپ اور قابلِ قدر ہو گئی ہے، یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اب تک نصاب کے لئے بنی کتابیں لکھی گئیں، وہ انگریزوں ہی کے بتائے ہوئے طریقوں پر ترتیب دی گئی ہیں، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی خاطر ایسی تاریخیں لکھیں جن سے ہندوستان کی رہنے والی قوموں میں خواہ مخواہ باہمی نفرت و کدورت پیدا ہوتی رہی، ہندوستان کے اسلامی عہد پر ریسرچ کرنے اور کتاب لکھنے والوں کا سب سے بڑا مانعہ ہنری الیٹ کی انگریزی تاریخیں رہی ہیں، معارف کے ان صفحات میں پہلے بھی یہ کہا جا چکا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے اس ایجنٹ نے نئی آٹھون جلدوں میں فارسی تاریخوں کے ترجمے اور اقتباسات کی ترتیب اس طرح دی ہے کہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ صرف جنگ و جدل، قتل و خونریزی اور ظلم و ستم کی داستان معلوم ہوتی ہے، الیٹ نے ہندوستان کے اسلامی عہد کے روشن پہلوؤں کو قصداً نظر انداز کر کے اسے صرف تاریک پہلو پیش کئے کہ ہندوستان کے باشندے انگریزوں کی حکومت کو سایہ رحمت سمجھ کر ان کو اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کرنے رہے، چنانچہ اس کا یہ مقصد اس کی کتاب کی پہلی جلد کے دیباچہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے، ہندوستان نے بھی نصاب کی کتابیں لکھیں لیکن ان میں زیادہ تر ایسے تھے، جو فارسی زبان میں جانتے تھے، اس لئے انھوں نے الیٹ کی تاریخوں ہی کو اپنا مانعہ بنا لیا، اور وہ اسلامی عہد کے ان تمدنی، ثقافتی، علمی اور عمرانی کارناموں کو بالکل بھولتے گئے، جن کا ذکر فارسی ماخذوں میں تو تھا لیکن الیٹ ان کو اپنی مختلف جلدوں میں مصلحتاً حذف کر تا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک خونِ الوداد و خونِ اشام تاریخ پڑھنے کے بعد طلبہ کے ذہن و دماغ پر وہی اثرات مرتب ہوتے رہے، جو انگریز چاہتے تھے، اور اب بھی جب کہ انگریز جاچکے ہیں، یہ زہریلے ذہنی اثرات مدتوں کی کوشش اور خاص نہج کی لکھی ہوئی کتابوں ہی کے ذریعہ سے دور ہو سکیں گے،

ہم سید ہاشمی صاحب کی زیر نظر کتاب کا خیر مقدم اس لئے کرتے ہیں کہ یہ عام نصاب کی

کی تاریخوں سے کچھ جدا گانہ حیثیت رکھتی ہے، کتاب محمد بن قاسم سے اور نگارِ زیب عالمگیر تک کے حالات پر مشتمل ہے لیکن اس میں مسلمانوں کی فتح و تسخیر کے علاوہ علیحدہ علیحدہ ابواب میں ہر دور کے انتظامی، تمدنی، اقتصادی، صنعتی، مذہبی، معاشرتی اور علمی کارناموں کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جو عام نصاب کی کتابوں میں کم پائے جاتے ہیں،

مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر کیا کیا سیاسی انقلابات پیدا کئے، ان کے تمدن سے یہاں کی معاشرت میں کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے، انھوں نے ہندوستان کی اقتصادی اور معاشی حالت کو بہتر بنانے میں کیا کیا تدبیریں اختیار کیں، ان کی وجہ سے تجارت و صنعت میں ہندوستان کتنا آگے بڑھ گیا، علماء و مشائخ نے مذہب و معاشرت کو کس طرح سنوارا اور پھر ان کی مذہبی تحریکات سے یہاں کے باشندے اپنے مذہبی خیالات میں کس حد تک متاثر ہوئے ان کے علوم و فنون کے سرچشمین سے یہاں کی سرزمین میں کس قدر سیراب ہوتی رہی، یہ تمام عنوانات ایسے ہیں جن پر علیحدہ علیحدہ مستقل کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، ظاہر ہے کہ جناب سید ہاشمی صاحب اپنی ایک عام اور مجمل تاریخ میں ان عنوانات پر بہت زیادہ پھیلا کر لکھنے سے محذور تھے، پھر بھی یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن سے طلبہ کو روشناس کرنا ضروری ہے، اور فاضل مؤلف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اختصار کے ساتھ ان تمام باتوں کو خوبی سے پیش کیا ہے، اور ان کو قلمبند کرتے وقت کچھ ایسا دلنشین انداز بیان اور سگفتہ طرز تحریر اختیار کیا ہے کہ عام پڑھنے والوں کو بھی یہ کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ نظر آئے گی، کتاب کے باب دوم میں "عربی حکومت سندھ میں" باب ششم میں ابتدائی نظام حکومت اور تمدن، باب ہفتم میں اسلامی علوم اور ادبیات، باب چہارم میں مذہبی خیالات اور نئے تاثرات، باب پانزدہم میں مشاہیر علم و ادب، اور باب ست و یکم میں گیارہویں صدی ہجری پر ایک نظر کے عنوانات سے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ نہ صرف طلبہ کے لئے مفید اور دلچسپ ہے، بلکہ ان سے نصاب کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے نئی شاہراہیں بھی کھلتی ہیں کہ اب

جب کہ بادشاہوں کی حربی و عسکری کارگزاریوں سے زیادہ قوموں کے مذہب و اخلاق، تمدن و معاشرت، علوم و فنون، تجارت و صنعت وغیرہ کے تدریجی ارتقاء و فروغ سے دلچسپی لی جا رہی ہے، تو انہی پہلوؤں کو زیادہ واضح کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس لئے بھی کہ طلبہ کا ذہن اپنے ماضی کی تاریخ بڑھ کر کچھ ایسا تیار ہو جائے کہ وہ اپنی تعلیم ختم کر کے اپنے ملک کے اسی قسم کے تعمیری کاموں کی طرف خواہ مخواہ متوجہ ہو جائیں،

اس میں شک نہیں کہ ازمنہ وسطیٰ کی گزشتہ تاریخیں جنگ و جدال کے واقعات سے کچھ ایسی لبریز ہیں کہ آج کا اہل قلم ان کی تفصیلات لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخیں عبد السبکی میں لکھی گئی ہیں، جب کہ ہر فرد اپنا جو ہر میدان جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اور جابل قلم اہل بیت بننے سے محذور رہے، وہ اپنی سپہگری کے دبے ہوئے جذبات کا غم کے صفحات پر منتقل کرتے رہے، وہ مختلف معرکہ آرائیوں کا مرقع اپنی کتابوں میں کچھ اس لئے بھی پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والوں میں بھی سپہگری کا دلولہ پیدا ہوتا رہے، لیکن اب ذہنی تربیت کی نوعیت ہی بدل چکی ہے، اس لئے تاریخ نویسی کے طرز کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے، مثلاً ہندوستان کے سلاطین میں محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، ایلک، علاؤ الدین خلجی، غیاث الدین تغلق، شیر شاہ اور تقریباً تمام شاہانِ مغلیہ نے کشور کشائی میں بڑی شہرت پیدا کی، اسی طرح ان بادشاہوں کے فوجی جنرل بھٹیاری، نصرت خان، ظفر خان، ملک کافور اور عہدِ مغلیہ میں، بیرم خان، ہنم خان، مرزا غنیمت کوک، اعجاز الدولہ، آصف خان، بہادر خان، میر جملہ اور شایستہ خان وغیرہ نے مختلف علاقوں کی تسخیر میں بڑی ناموری حاصل کی، لیکن آج کل ملک گیری اور سامراجیت دونوں ایک ہی چیز سمجھی جاتی ہیں، اس لئے موجودہ مذاق پر فتوحات کی تفصیلات گراں گذرتی ہیں، مگر مذکورہ بالا فاتح اپنے زمانے کے کچھ ایسے سپہ سالار اور سپاہی بھی تھے جن پر قوم کو ناز ہو سکتا ہے، اب ان کی ملک گیری کی تفصیل لکھنے کے بجائے ان کی شجاعت، بہادری،

جانبازی کے قصے، اور ان کی سپہ سالاری اور سپہ گری کے آرٹ مرتب طریقہ پر پیش کئے جائیں، تو یہی سامراجی قوت کے ظہور و تاریخ کے پردے پر کچھ اور ہی حیثیت سے جلوہ گر ہو جائیں گے، اگر یہی یورپ کی کسی قوم کے افراد ہوتے تو نہ جانے وہاں کے اہل قلم کے اوصاف کو کن کن طریقوں سے پیش کر کے ان کو خواہ مخواہ قومی ہیرو بنا دیتے، دور کیوں جانیے، کرنل ٹاڈ نے راجپوتوں کی شجاعت و بہادری کے قصے کچھ ایسے دلاؤ پر پیرائے میں پیش کئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر بہادری اور معرکہ آرائی کی ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے، زیر نظر کتاب کے فاضل مؤلف نے کرنل ٹاڈ کو راجپوتوں کا فرنگی بھاٹ کہا ہے، وہ بھاٹ ہی سہی لیکن اس کی مداحی اور بھٹی نے راجپوتوں کی سپہ گری کو زندہ کرنے میں جو مفید خدمات انجام دی ہیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے، غزنویوں، غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، اور مغلوں کی تاریخیں بھی ان کی عظیم المثال شجاعت اور غیر معمولی بہادری کے واقعات سے بھری پڑی ہیں، لیکن آج تک کسی اہل قلم نے ان کو ولولہ انگیز طریقہ سے پیش کرنے کی تکلیف ہی نہیں اٹھائی، اس لئے ان کے جوہر کمال پر بھی پردہ پڑا ہے، میدانِ رزم سے ہٹ کر بزمِ سیاست میں بھی بہت سے سلاطین، وزراء، اور امرا ایسے گزرے ہیں جن کی سیاست، فراست، اور دور اندیشی کا تجزیہ کیا جائے، تو پولیٹیکل سائنس کا ایک قابل قدر لٹریچر جمع ہو جائے، لیکن کسی نے ان کو بھی قلمبند کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نظر سے وہ تمام پہلو اوجھل ہیں جن کی وجہ سے ماضی کی تاریخ شاندار کہی جاسکتی ہے، اور ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری تاریخ ویسی شاندار نہیں جیسی کہ ہوتی چاہئے، حالانکہ یہ بیچ مینیں، بلکہ ہم کو ہمارا ماضی ایسا شاندار نظر نہیں آتا، جیسا کہ یہ واقعی تھا، اور یہ قصور ہمارے مورخوں کا ہے، جنہوں نے اپنے ذوق، اور ماحول کے مطابق اس عہد کی صرف ایسی ہی باتیں قلمبند کیں، جو آج پسند نہیں کی جاتیں، اور ہماری تاریخ انشاء و اختلاں ہی کی ایک لامتناہی داستان معلوم ہوتی ہے۔

از منہ و خطی کا یہ انشاء اور اختلاں، اور ان سے پیدا ہونے والی ساری خوبیاں انگریزوں کی

تاریخ میں بھی موجود ہیں، لیکن انگریز مورخوں نے اپنی تاریخ کتے وقت ان خرابیوں کو اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ ان کا ماضی آتشاشارہ معلوم ہونے لگا ہے، جتنا کہ وہ واقعی نہ تھا، لیکن ہمارے مورخ، ہمارے ماضی کو اتنے شاندار طریقہ پر پیش نہ کر سکے، جیسا کہ یہ سچ مچ تھا، ان فروگزاشتوں کی نمانی نے اہل قلم ہی کر سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس تلافی کے لئے غیر معمولی تلاش تحقیق، اور اسعانِ نظر کی ضرورت ہے، اور جب ایسی قابلِ قدر محققانہ کتابیں شائع ہو چکیں گی، تو ان کا پختہ طلبہ کی درسی کتابوں میں بھی شامل ہو سکے گا، تاکہ صحیح معنوں میں ان کی ذہنی تربیت ہو سکے۔

محترم سید ہاشمی صاحب نے جس محنت و کوشش کے ساتھ اس کتاب کو ترتیب دیا ہے، وہ ایک حد تک گزشتہ فروگزاشتوں کی تلافی ہے، لیکن وہ ایک کم نہ مشق اہل قلم اور وسیع النظر مورخ ہیں اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ ان کی اس کتاب میں اور بھی زیادہ خوبیاں ہونی چاہئے تھیں، تو شاید بے جا نہ ہو گا، ہم ان کا پورا احترام کرتے ہوئے ان کی توجہ بعض باتوں کی طرف مبذول کراتے ہیں،

انہوں نے اپنی کتاب میں اور پینل ماخذوں کا حوالہ ضرور دیا ہے، لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ انہوں نے جاکوال فنسٹن، آکس فورڈ، ہٹری گبن کی تاریخ ہند، لین پول، راورٹی، ایڈورڈ ڈامس، الیٹ، مورلیڈ، بلوخ من وغیرہ کا بھی حوالہ دے کر اپنی کتاب کو داغدار کیا ہے، ان انگریز مورخوں نے مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کو کچھ ایسا نقصان پہنچایا ہے کہ ان کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا بہتر تھا، خواہ ان کی کچھ رائیں ہمارے لئے کتنی ہی موافق اور خاطر خواہ کیوں نہ ہوں، فاضل مؤلف خود ہی رقمطراز ہیں کہ انگریز تاریخ نویس عموماً جاہل و حد سے یافتہ پرداز ہیں اور تقریق اندازی کے لئے واقعات کو دست سے مسخ کرتے، اور مسلمانوں کے دورِ حکومت کو برے سے برے رنگ میں دکھاتے رہے ہیں، لیکن اس رائے کے باوجود یہ کہنا شاید نامناسب ہو گا کہ فاضل مؤلف انگریز مورخوں سے کچھ متاثر

بھی ہیں اور نہ وہ اپنی کتاب میں ان کو دودھ کی کھی ہی کی طرح نکال کر پھینک دیتے، اور پھر محمد بن قاسم کی فتوحات کا ذکر یہ لکھ کر نہ شروع کرتے کہ

"لین پول نے محمد بن قاسم بن محمد کی کمائی کو تاریخ کا ایک رد مانس بنایا ہے"

(صفحہ ۸۰)

اور اس رد مانس کی گویا تائید کرتے ہوئے اس کی نوعیت یہ بتائی ہے کہ ایک دن حجاج نے محمد بن قاسم سے جو رشتے میں اس کا بھائی ہوتا تھا کہا کہ اے ابن عم میں تجھے پڑھانا چاہتا ہوں تیری جو خواہش ہو بیان کر، محمد نے کہا مجھ سے اپنی لڑکی بیاہ دے، اس کے بعد حجاج نے دو مرتبہ محمد بن قاسم کے سر پر چھڑی مار کر وہی سوال کیا، لیکن محمد نے ہر مرتبہ وہی جواب دیا، آخر سخت دل حجاج بولا کہ اچھا شرط یہ ہے کہ تو نئے ملک فتح کرے، اور انھیں ایسا ضبط میں لائے کہ پھر ہاتھ سے نہ جائیں، اس کے بعد کم سن محمد بن قاسم نے اس شرط کو خوبی سے پورا کیا، معلوم نہیں فاضل مؤلف نے اس رد مانس کا ذکر کرنا کیوں پسند فرمایا ہے حالانکہ انھوں نے جامع عثمانیہ کے لئے جو تاریخ ہند لکھی تھی، اس میں اس زنگین داستان کا ذکر نہیں تھا، معلوم نہیں اب کوئی مصلحت پیدا ہو گئی ہے کہ طلبہ کو اس رد مانس کا بتا دینا ضروری سمجھا گیا ہے، خود فاضل مؤلف کا بیان ہے کہ

"حق یہ ہے کہ محمد بن قاسم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کا پہلا سردار و کاروان سالار ہے، یہ مبارک نام ان کے دلوں سے کبھی نہیں مٹے گا، اور اس کے کارنامے ملت اسلامی خصوصاً پاکستان کی تاریخ میں قیامت تک یادگار اور احترام و احسان مندی کے سزاوار رہیں گے۔"

انھوں نے جامع عثمانیہ کے لئے جو تاریخ لکھی تھی، اس کے حصہ دوم میں انہی جذبات کا اظہار

لے عام تاریخوں میں ہے کہ محمد بن قاسم حجاج کا بیٹا تھا،

اور بھی نوٹز طریقہ پر لکھا تھا، اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ

"مجموعی طبع پر عرب فاتح سندھ کے جنگی کارناموں کے مقابلے میں کسی سپہ سالار کا نام پیش کیا جاتا ہی، تو دو موسیٰ بن نصیر یا طارق فاتح اندلس یا قیس بن مسلم ہیں جو اسی زمانہ میں ایک طرف دمشق و اندلس، اور دوسری طرف سندھ و بخارا میں پورے فتوحات حاصل کر رہے تھے" (ص ۸۲)

اب سوچنے کی بات ہو کہ کیا پاکستان و ہند کے مسلمانوں کے پہلے سردار و کاروان سالار اور ایسے جلیل القدر سپہ سالار کے قابل یا دگار و دلائق احترام جنگی و فنی کارنامے مذکورہ بالا رد مانس کے ذکر سے نہیں پڑ جاتے؟

پھر محمد بن قاسم کے مجاہدانہ فتوحات کا خاتمہ حسب ذیل طریقہ پر کیا گیا ہے،

"جب ملتان کا مال غنیمت حجاج کے پاس پہنچا، تو خوشی سے پھولا نہ سایا، اور بچارا ٹٹا کر اب میرادل ٹھنڈا ہوا، اب میرے سر سے بوجھ اترا، ۶۱ کر در در ہم اور داہر کا سر زمین نفع میں ملا"

(ص ۸۰)

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا وہ کائنات جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ ملت اسلامی کی تاریخ میں احسان مندی کے سزاوار ہیں گے، ۶۱ کر در در ہم، اور ایک انسان کے سر ہی کے لئے تھے؟ ممکن ہے کہ شکر دل حجاج نے ایسا کہا ہو، لیکن نصاب کی ایک تاریخ میں اس کو نہ لکھا جاتا، تو شاید واقعات کی کسی ترتیب میں کوئی خلل نہ پڑتا، اسی طرح دہل کی فتح کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ

"بڑے مندر ہی کی مرلیان سات سو تھیں، جو بتوں کی پرستاری سے نکل کر مسلمانوں

کی کینزری میں داخل ہوئیں" (ص ۸۳)

اس قسم کی باتوں کے ذکر کے بجائے اگر محمد بن قاسم کی ہر دلعزیزی، اس کی طبعی شرافت، ذاتی فراہم، اہل کی پابندی بے نفسی، بہادری، اہل سندھ کے ساتھ نرمی، فیاضی اور مذہبی رواداری کے واقعات

قلبتہ کے جاتے، تو اس مجاہد اسلام کی سچی عظمت و وقعت طلبہ کے دلوں میں بھی قائم ہوتی، اور یہ خوب ثابت ہو جاتا، جیسا کہ فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ

”سندھ میں راج کا بدلنا خدا کی مہربانی تھی، قرآن تھا“ (ص ۸۵)

محمد بن قاسم کے بعد سندھ میں عراق سے غالباً ۳۰ وائی بھیجے گئے، اور یہاں عربوں کی حکومت تقریباً دو سو سال رہی، اور پھر ان کے بعد دوسرے مسلمان حکمران خاندانوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن عام طور سے محمد بن قاسم کے نام کے علاوہ اور دوسرے دالیوں اور حکمرانوں کا ذکر ہی نہیں کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کے اس طویل دور حکومت کی تاریخ تاریکی میں پڑ گئی ہے، تعجب ہے کہ ہمارے اہل مؤلف نے بھی تین چار صفحوں میں ایک سرسری تبصرہ کر کے اس دور کی تاریخ کو ختم کر دیا ہے، یہ تسلیم ہے کہ ان کی مختصر کتاب میں تفصیل و وضاحت کی گنجائش نہ تھی، لیکن سندھ اب پاکستان کا ایک اہم حصہ ہے، غالباً اس کے تعلیمی اداروں میں یہ کتاب ضرور پڑھائی جائے گی، اس لئے فاضل مؤلف جیسے اہل قلم سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اختصار کے ساتھ طلبہ کو سندھ کے ان تمام حکمرانوں کے کم از کم نام ہی سے روشناس کرا دیتے جو تقریباً تین سو سال تک اس خطہ میں اسلامی پرچم لہراتے رہے، اب اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ بقول لائق مؤلف مسلمانوں کی تاریخ گتہ نظر نہ آئے،

فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ ادرسی اپنے جغرافیہ میں اسلامی سندھ کا ایک دلپند مرقع پیش کرتا ہے، اور اسے چڑھ کر یہ ماننے میں کچھ نا اہل نہیں رہتا کہ تین صدی کی حکومت میں مسلمانوں نے ان ملکوں کو کچھ سے کچھ بنا دیا تھا، ادرسی کے علاوہ بشاری مقدسی، ابن حوقل، ابن خرداد بہرہ، ابن فقیہ وغیرہ کی مدد سندھ سے متعلق بہت سی نئی تحقیقات ہو چکی ہیں، جن سے ہمارے فاضل مؤلف عاجز و قہم سے زیادہ واقف ہوں گے، شاید انھوں نے اپنی کتاب کے حجم کو کم کرنے کی خاطر ان سب کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا، ورنہ یہ ہر ہے کہ ان نئی تحقیقات کے مطابق اگر اس زمانہ کے سندھ

کی زمینی، تجارتی، صنعتی، تعمیری، اور علمی ترقیوں کے ساتھ حکومت کے رفاہ عام کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ ہونا، تو خود زیر نظر کتاب میں بھی اسلامی سندھ کا ایک دلپند مرقع نظر آتا، آئندہ کے اہل قلم اور خصوصاً نصیب دینے والوں کو یہ سوچنا ہے کہ گزشتہ تاریخ کو وہ کن کن صورتوں سے دلپند مرقع بنا سکتے ہیں، کیا ان کے اہل قلم کو سندھ کی بھولی ہوئی تاریخ کو اور بھی زیادہ دلاؤ و بڑھتی پریش کرنا ہے،

باب سوم میں محمود غزنوی کے حالات و واقعات ہیں، جس کے متعلق فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ مسلمان مورخ کی نظریں نہ تھکنے والا غازی اور ملت اسلامی کا محبوب سورما ہے، اس میں شک نہیں کہ اس باب میں محمود غزنوی کی ایک اچھی تصویر پیش کی گئی ہے، لیکن یہ اتنی اچھی نہیں جتنی کہ ہم کو فاضل مؤلف کے شگفتہ قلم سے امید تھی، الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ایشوری پرشاد کی کتاب ڈیول انڈیا، ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، پروفیسر ایشوری پرشاد نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں پر اپنی کتاب میں جا بجا جو سخت تنقیدیں کی ہیں، وہ مشہور ہو چکی ہیں، محمود غزنوی بھی ان کے بیرو ملت سے محفوظ نہیں رہا ہے، پھر بھی انھوں نے ”An Estimate of mahmud“ کی نئی سرخی کے تحت محمود کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے، وہ یقیناً ہمارے محترم مؤلف کی پیش کردہ تصویر سے بہتر ہو گا، لہذا محمود کی کردار نگاری میں فطری طور سے ان کے قلم کو زیادہ روان اور جولان ہونا چاہیے تھا، محمود غزنوی کی تاریخی شخصیت ایسی ہے کہ اس کا ہندو مسلمان کے تعصب سے بند ہو کر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ ایک ایسا جنرل تھا جو پنجاب سے لے کر بحیرہ خزر تک اور سمرقند سے لے کر سبک اپنے نام کا ڈنکا بجا مارا، اکی شاندار فتوحات سے اس کے سارے معاصرین حیران و ششدر رہے، اُس نے ۳۳ برس کی پیم لڑائیوں میں ایک دفعہ بھی شکست نہ کھائی، ایک بے مثال سپاہی ہونے کے علاوہ وہ بہت ہی محبوب اور رحمدل انسان بھی تھا، ایک مہربان اور انصاف پسند حکمران کے علاوہ ایک جا ب قسم کا حاکم بھی تھا، جس کے دور واز علاقوں میں کوئی فزائی اور غارت گری کی ہمت نہ نہیں کر سکتا تھا، وہ علوم و فنون کا بہت بڑا مہربانی

بھی تھا اور ڈوئیشن اور بزرگوں کا ادنیٰ خدمت گزار بھی، وہ بے شک دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں سے تھا اور نہ میں سے تھا، خود ہمارے فاضل مولف رقمطراز ہیں کہ

”اُس کی شجاعت و عدالت، سخاوت و سخاوت کے اتنے قلعے محفوظ تھے کہ جمع کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے“

زیر نظر کتاب میں اگر دو دو چار چار قصبے ہی لکھ دیئے جاتے، تو کیا مضائقہ تھا یہ کیا ضرور ہے کہ ہماری تاریخ کے صفحات جا رہا نہ جنگ و جدال ہی کے واقعات سے پر کئے جائیں، اگر معتبر اور مستند قصبوں اور حکایتوں سے ہماری تاریخ یا تاریخی شخصیتوں کی عظمت و جلالت بڑھتی ہو تو ہم ان کو بلا تاریخ کے صفحات میں ضرور جگہ دین، لائق مولف نے اپنی تاریخ کے گزشتہ ایڈیشن میں شاہانِ غزنوی کی علم نوازی کے عنوان سے جو کچھ لکھا تھا، اس کو موجودہ ایڈیشن میں شامل کرنا پسند نہیں کیا ہے اور محمود کی معارف نوازی کا ذکر چند سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا ہے حالانکہ اس سلطان کی علم پروری اس عہد کا بڑا ہی شاندار کارنامہ ہے۔

ہمارے فاضل مولف نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں سلطان محمود کے ہندوستان پر حملوں کا ذکر بہ لکھ نظر انداز کر دیا تھا کہ اس کے محل حالات اس زمانہ کی عام انگریزی اور دواری خون میں موجود ہیں پھر اسی کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ترتیب زمانی کے ساتھ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ غوریوں کے آنے تک ہندوستان کے شاہانِ غزنوی کے کیا تعلقات رہے، تاکہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا سلسلہ جو اکثر انگریزی تاریخوں میں جا بجا گسستہ نظر آتا ہے، حتیٰ الامکان ٹوٹنے نہ پائے، اس کے بعد محمود کے جانشینوں کا ذکر شروع ہو گیا ہے، لیکن اس نئے ایڈیشن میں فاضل مولف نے محمود غزنوی کے حملوں کی تفصیل لکھنا ضروری سمجھا ہے، اور محمود کے جانشینوں کے حالات کو شاید غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، اور ایک ضمیمہ میں سلاطین غزنویہ کے صرف نام اور ان کے دورِ حکومت کے سنیں

لکھنے پر اکتفا کیا ہے، لیکن ہم کو فاضل مولف کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ محمود غزنوی کے جانشینوں کا ذکر ضروری تھا تاکہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ گسستہ نظر نہ آئے، ڈاکٹر ناظم نے اپنی انگریزی کتاب سلطان محمود آف غزنہ میں بڑی دیدہ ریزی اور کاوش سے محمود کے پیچھے حملوں کی ترتیب و تفصیل لکھی ہے، ظاہر ہے کہ فاضل مولف کی نظر اس ترتیب پر ضرور پڑی ہوگی لیکن معلوم نہیں کہوں اس ترتیب کے مطابق اپنی کتاب میں ان حملوں کا ذکر کرنا پسند نہیں فرمایا، اسی طرح اور دوسرے فرمانرواؤں اور فاتحوں کی فتوحات کی تفصیل لکھنے میں بھی ہمیں محترم مولف نے کچھ بخل سے کام لیا ہے تفصیل سے مراد ہرگز نہیں کہ ہر مسلمان حکمران کے دور میں جو چھوٹی بڑی لڑائیاں ہوتی رہیں، ان کا ذکر کیا جاتا، لیکن ان علاقوں کا کم از کم نام تو بتانا ضروری تھا، جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے زیرِ نگین آتے رہے، اور ہر ایک اہل اور سرسری معلومات فراہم کرنے سے طلبہ کے معلومات کے ہمیشہ کے لئے سبھی رہ جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اختصار کے ساتھ جامعیت ایک آرٹ ہے، جس پر قدرت، لکھنا نصاب کی کتاب لکھنے والوں کے لئے لازمی ہے، اب تک نصاب کی تاریخیں لکھنے وقت وقت نظر کام نہیں لیا جاتا تھا، اسی لئے ہمارے طلبہ کو تاریخی معلومات میں وہ زرف نگاہی نہیں پیدا ہوتی تھی، جو ان کے لئے ضروری ہے، تاکہ وہ قومی و ملی مسائل کو گہرائی اور وقتِ نظر سے حل کر سکیں،

سلاطین اور بادشاہوں کی کردار نگاری میں بھی ہمارے فاضل مولف نے بخل اور غفلت دونوں سے کام لیا ہے، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس میں محمد بن قاسم سے لے کر مالک بن دینار تک جتنے حکمرانوں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک کی بھی زندگی و سیرت یا اخلاق و کردار یا اس کے مختلف کارنامے ایسے ہیں، جس کو طلبہ اپنے مذہبی، قومی اور ملی جذبات کی بنا پر اپنا ہیرو بنا سکتے ہیں، یا تو ہم تسلیم کر لیں کہ اس ایک ہزار سال کی مدت میں کوئی ایسا حکمران پیدا ہی نہیں ہوا، جس کے اوصاف کی تفصیل بیان کر کے ہم طلبہ کے مذہبی، قومی، اور ملی اخلاق

سیرت کی تعمیر کر سکیں یا پھر ہم کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمارے گزشتہ عہد کے مؤرخوں کی غفلت اور قبیح کوتاہی کی وجہ سے ان حکمرانوں کی زندگی کے روشن پہلو پر تاریکی کے پردے پڑ گئے، موجودہ دور کے اہل قلم کو اسی تاریک پردے کو اٹھانا ہے، ظاہر ہے کہ زیر نظر کتاب محض ایک نصاب کی تاریخ تحقیق و تدقیق کا کوئی جز نہیں لیکن تھوڑی سی محنت سے اس کتاب میں بھی الیمیش کی درویشی و خدا ترسی، ناصر الدین محمود کی نیک نفسی و پرہیزگاری، غیاث الدین خلعتی اور فیروز شاہ تغلق کی حق شناسی و شہریت پسندی، اور عالمگیر کی دینداری و مذہب نوازی کی تفصیل لکھ کر طلبہ کے ذہن ہی شور کو بیدار کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح مفتوحین کے ساتھ محمد بن قاسم کی صلح کل پالیسی، مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر شیر شاہ کی رعیت پروری، ہندوؤں کے ساتھ ہمایوں کی نرمی و شرافت، اکبر کی محبت و مساوات، جہانگیر کی دوستی و مرتد کی حکایتیں بیان کر کے طلبہ کو سیاسی رواداری کا سبق پڑھایا جاسکتا تھا۔ محمود غزنوی، بلبن اور جہانگیر کی انصاف پسندی اور عدل گستری کے قصے سنا کر طلبہ کے اخلاق و کردار کا نیا اونچا کیا جاسکتا تھا، بلبن کی سطوت و عظمت، علاء الدین خلجی کے جلال و جبروت، اور شاہ جہان کی شہرت و شوکت کی تصویر کھینچ کر فاضل مولف طلبہ کو حکمرانی کے رموز و نکات سے آگاہ کر سکتے تھے،

مسلمان حکمرانوں میں عبوب و نقائص ضرور تھے، کسی کو اس سے انکار نہیں لیکن اگر ان کے عیوب و نقائص ہیں پلہ بھاری رہتا تو ظاہر ہے کہ ان کی حکومت چند دنوں سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ قومی حیثیت سے تقریباً وہ ایک ہزار سال تک اس ملک کے سیاہ و سپید کے مالک رہے، جو اس کی دلیل ہے کہ ان کی حکومت میں اچانیاں زیادہ تھیں اور جرائیاں کم لیکن دو سو سال تک انگریز مورخین اور ان کے مقلدین ان کی اچائیوں کو حذف کر کے ان کی برائیوں کو اچھا لیتے رہے، اگر اب جب کہ بھارت میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے، اور پاکستان میں ایک نئی مملکت کی بنیاد ڈالی گئی ہے تو تاریخ کو ایک نئے زاویہ سے لکھنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ یورپین مؤرخوں نے

جیسا کہ مذکورہ بالا پنا معیار قائم کر رکھا ہے، اسی کے مطابق ہم بھی اپنے اسلاف کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کریں، ہمارے پاس خود ہی ایک پیمانہ ہے، اسی کے مطابق ہم اپنی تاریخ لکھیں، ممکن ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران اسلام کے صحیح اور سچے نمائندہ نہ ہوں لیکن پھر بھی تدوین ایک ہزار سال کی مدت میں ان میں سے بعض سلاطین بڑے ہی اولوالعزم اور جانباز فاتح تھے، بعض بڑے ہی ہوشیار اور بیدار منہ سیاست دان تھے، بعض بڑے ہی متقی اور عابد تھے اور بعض بڑے ہی علم دوست اور ہنر پرور تھے، ان تمام حکمرانوں کی مجموعی خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست معاشرہ تہذیب، تمدن کو بڑا فروغ ہوا، بعض مذہب شرب اور پیش پند سلاطین بھی تھے، لیکن ان میں بھی کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور تھیں، اگر ان زنجار لگ حکمرانوں کے تمام اوصاف کو سلیقہ اور محنت سے جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو ہمارے ماضی کی تاریخ بلاشبہ جگمگا اٹھے گی، اور یہ کام لائق موفقت ہی جیسے وسیع النظراؤں کے فاضل مولف کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ پورے انہماک کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوں،

معلوم نہیں فاضل مولف نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا ذکر صرف جا بجا چند سطروں میں کرنا کیوں پسند کیا حالانکہ اس دور کی تاریخ کا بڑا اہم اور شاہکار موضوع ہے، اس کے لئے تو غلطہ ہا قائم کرنے کی ضرورت تھی، اسی طرح اس دور کی بادشاہت کی نظری و عملی نوعیت، وزراء کی حیثیت، قومی و درجہ بنی نظام، تعلیمی نظام، عدل و احتساب کے طریقے، رفاہ عام کے محکمے، صوبوں کے نظام حکومت وغیرہ پر غلطہ غلطہ عنوانات قائم کر کے، ان کا مرتبہ پیش کیا جاسکتا تھا، ان تمام موضوعات پر کافی تحقیقات کی جاسکتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی تفصیلات ہمارے فاضل مولف کی نظروں سے ضرور گزری ہوں گی، شاید طوالت کے خیال سے ان کو پھیلا کر لکھنا پسند نہیں فرمایا ہو، لیکن طوالت سے بچنے میں ہماری تاریخ کا محض ایک دھندلا سا خاکہ نظر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ منفرد مسائل نتائج پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو پھر ضروری

طوالت ہی گوارا کر لینا مناسب ہے طلبہ کے ذہن و دماغ کو تاریکی میں رکھنے سے کہیں زیادہ بہتر ہو
ایک ضخیم کتاب لکھ کر کئی سال میں تدریجاً ختم کرانی جائے،

میرے ان معروضات سے شاید مؤلف کو شکایت پیدا ہو کہ ان کی کتاب میں ضرورت سے
زیادہ مسائل کی توقعات خواہ مخواہ قائم کر لی گئی ہیں، جن کو عمل میں لانا آسان نہ تھا، ممکن ہی نہ تھا
جیسی کتاب لکھی ہے، ویسی ہی کی طلب ان کے ملک میں ہو، لیکن اس عاجز راقم کے ذہن میں بس نہیں
ایسی تھیں، جن کا اظہار محض نیک نیتی سے اس لئے کیا گیا ہے کہ اب جب کہ حالات کے ساتھ ذوق
بھی بدل چکا ہے، تو نصاب میں مسلمان حکمرانوں کی ایک ایسی تاریخ ہونی چاہئے جو ان کے عہد کا واقعی
ایک دلائل و براہین و دلکش مرقع ہوتا، تاکہ طلبہ کو اپنی گزشتہ تاریخ کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہو،

بزم صوفیہ

از

جناب ڈاکٹر بزرگوار محترم نقی، صدر شعبہ اسلامیات کلمتہ یونیورسٹی

ادب باب تصوف نے تاریخ اسلام کے ہر دور میں ہر اسلامی ملک کی تاریخ میں ایک خاص شاندار
حصہ لیا ہے، ان بزرگوں نے اگر ایک طرف اپنی زندگی کی سادگی اپنے عجز و انکسار، اپنے نخل و موضع
اپنی محبت و مودت کی ہمہ گیری، اور اپنے دلوں کی وسعت اور فراخی سے غربا کے لئے سکون و مجاہد
کے لئے راحت اور ستم رسیدہ بندگان خدا کے لئے صبر و شکر کے سامان ہم پہنچائے، تو دوسری طرف
جاد و ثروت سے اپنی بے تعلقی اور مملکت و سلطنت سے اپنی بے گانگی، بلکہ بنیاری سے امراء و سلاطین
کے نشہ امارت و حکومت کو توڑا، اور ظلم و استبداد کو روکا، ان بزرگوں کے سوانح حیات آج بھی
بہتیرے ڈٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں اکسیر کا کام دیتے ہیں، جس درد کی دوا ہمارے بڑے بڑے

بزرگوں کی لمبی لمبی تقریروں میں نہیں ملتی، اس کا علاج ان اسودگانِ جناب کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی حکایتوں
کثرت سے ملتا ہے،

ہندوستان کے انہی ارباب تصوف میں سے ۱۱۹، اکابر و مشاہیر کے سوانح حیات سید صاحب الدین
علیہ الرحمہ صاحب نے ان حضرات کے تالیفات، ملفوظات اور مکتوبات میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر
اور دوسری کتب سیر و تاریخ میں سے چُن چُن کر اپنی کتاب "بزم صوفیہ" میں جمع کر دیے ہیں،
صباح الدین صاحب تاریخ کے ماہر اور فن تالیف و تصنیف میں مشاق ہیں، بزم صوفیہ کی
تصنیف میں اپنی قابلیت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور کتاب کے موضوع پر مختلف مآخذ
میں جو کچھ انکوں کا، اس کو نہایت سلیقہ سے اکٹھا کر دیا ہے،

کتاب کا موضوع مشکل ہے، اور اس کے مآخذ میں معتبر اور غیر معتبر ہر طرح کی روایتیں داخل
ہیں، ایک تو فی سیر کی کتابوں میں عموماً ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں داخل کر دی گئی ہیں، دوسرے صوفیہ کرام
کی سیرتیں، اور حالاتِ زندگی عموماً ان بزرگوں کے مریدوں اور عقیدہ مندوں نے لکھے ہیں، اس لئے ان کتابوں
میں کراماتِ ادبیہ کی عجیب عجیب حکایتیں نظر آتی ہیں، ان بزرگوں کے ملفوظات بھی زیادہ تر ان مریدوں
نے ہی جمع کئے ہیں، اس لئے ان کتابوں میں بھی جو عام طور پر غلطی سے ان بزرگوں کی ہی تحریریں مانی جاتی
ہیں، مریدوں اور عقیدہ مندوں کے خیالات کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو کچھ خود ان مقدس حضرات نے
سپردہ قلم کیا ہے، اس میں بھی ان بزرگوں کے خاص خاص روحانی، اور جذباتی حالات کا بیان کثرت سے پایا
جاتا ہے، اور ان حالات کو تو ایسا ہی آدمی سمجھ سکتا ہے، جس کو خود ان روحانی کیفیات کا تجربہ ہوا، اور علومِ انسانی
جن میں بہتیرے علماء بھی داخل ہیں، ان رموز کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ محمد بن
ابن العربی کی تحریروں کے متعلق علماء کی ایک بڑی جماعت چرمیگوئیوں اور مشرکوں کیان کرتی ہوئی نظر
آتی ہے،

سید صباح الدین صاحب نے جن مآخذوں کو استعمال کیا ہے، ان سے ہر قسم کے مضامین تو اخذ کرنے میں لیکن خود ان مآخذوں کے قابل اعتبار ہونے پر کوئی بحث نہیں کی ہے، مثال کے طور پر حضرت مخدوم سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی کی لطافتِ اشرفی کو لیجئے، اس کتاب سے نہج موفیہ کے مولف نے بہت کچھ چیزیں اخذ کی ہیں لیکن یکین نہیں بتایا کہ یہ کتاب کہاں تک قابل اعتبار ہے، حالانکہ انگلستان کے مشہور مشرق ڈاکٹر ریو نے اپنی فہرست مخطوطاتِ فارسیہ موجودہ محقق برطانیہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب کی تناقض (Amachnonism) سے بھری پڑی ہے، لہذا میرے خیال میں لائقِ نولف کا فرض تھا کہ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالتے،

اصل یہ ہے کہ یہ کتاب خود مخدوم موصوف نے لکھی ہی نہ تھی، بلکہ ان کے ایک عقیدہ مند مرید نے ان سے جو سنا تھا، اس کو سپرد قلم کر دیا تھا،

اس کے علاوہ مخدوم صاحب نے اپنے زمانہ سیروسیات میں بہترے علماء و فضلا اور اولیاء اللہ سے مذاقین کی تھیں جن کا ذکر لطافتِ اشرفی میں کیا گیا ہے، ان میں بعض ایسی بزرگ ہستیوں کا بھی ذکر آگیا ہے جو حضرت مخدوم سے قبل ہی واصلِ حق ہو چکی تھیں، اب ان بزرگوں کا ذکر ممکن ہے کہ کتاب صاحب نے غلط فہمی سے کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت مخدوم نے نقائص روحانی کا ذکر کیا ہو جس کو کتاب صاحب نے نقائص جسمانی سمجھا ہو،

حضرت مخدوم موصوف کی ایک اور کتاب مکتوباتِ اشرفی ہے جس میں وہ خطوط جو حضرت نے مختلف سلاطین، اماراء، وزراء، علماء اور اولیاء اللہ کو مختلف مقامات میں لکھے تھے، جمع کر دیئے گئے، ظاہر ہے کہ یہ خود حضرت کی تحریریں ہیں، ان مکتوبات میں بہترے واقعاتِ حاضرہ پر اخبار رائے کیا گیا ہے اور متعدد مسائلِ تصوف پر لول و لیل بحثیں بھی اس میں ملتی ہیں، نولف نے نہج موفیہ میں اس کتاب کا ذکر نہ کیا ہے لیکن یہ کتاب دیکھی نہیں ہے، حالانکہ اس کے متعدد نقلی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں

اس کا ایک نسخہ حضرت سید شاہ شاہ علی صاحب سبز پوش گورکھپور کے کتب خانہ میں بھی ہے، میں نے اس کے بڑے بھائی کا مطالعہ کیا ہے، کتاب تاریخی، اور علمی حیثیت سے بہت اہم ہے، نولف نے نہج موفیہ کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے تھا،

نولف کو اپنے مقدمہ میں تمام اہم مآخذوں کا ذکر کر کے ان کے معتبرا اور غیر معتبر ہونے پر بحث کرنا چاہئے تھا، ان کو یہ بھی بتانا تھا کہ ان کتابوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے، اور عام سیاسی کتب تاریخی ان کتابوں کے مقصد بالیف میں کیا فرق ہے، اور یہ تمام مآخذ ہندوستان کی سماجی اور اخلاقی تاریخ پر کیا روشنی ڈالتی ہیں،

موصوف کرام کے حالات لکھنے میں بھی نقادانہ حیثیت سے جزئیات پر بھی نگاہ رکھنے کی ضرورت تھی کتاب میں کرامات کا ذکر نہیں ہے، ان کے ذکر کرنے میں میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہ تھا، بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا جاتا کہ ان قصبے کما یون میں کون سے اخلاقی اور سماجی رائج تھے،

ان باتوں کے باوجود نہج موفیہ، میرے خیال میں اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے، اس کا مطالعہ ہر شخص کے لئے مفید ہوگا، بہترے شکستہ دل انسان اس میں اپنے درد کی دوا پائیں گے، موجودہ پاشوب زمانہ میں اس کا مطالعہ خاص طور پر روح افزا اور سکون بخش ثابت ہوگا، سید صباح الدین صاحب اردو خوان طبقہ کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی دیدہ و ریزی کر کے ایسی کتاب اردو ادب کے سہلک کے سامنے پیش کی،

فیہ مافیہ

ملفوظات مولانا روم جو ایک نایاب کتاب تھی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے مختلف نسخوں سے مقابلہ

کر کے اس کو مرتب کیا، اور معارفِ پریس عظیم گڑھ میں چھپوایا،

قیمت :- ۱۰۰ روپے

منہج

انجمن

بھارت کے مسلمان

از

جناب جگر ناتھ صاحب آزاد

"مذکورہ بالا نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے، وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع کھل نہیں ہو گئی ہے، اس نظم کی قدر و قیمت اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کا لکھنے والا گذشتہ انقلاب کا ستیا ہوا مغربی پنجاب کا ایک بے غمان ہندو ہی یہ نظم اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے گزرے، اس لئے اس کو اخبارِ اجماع سے نقل کیا جاتا ہے عم کو امید ہے کہ انسانی اخوت و محبت کی اس آواز کا جواب پاکستان بھی دیا جائے گا، م"

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان ہر سامان
کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل تراجمان
دانش کدہ دہر کی اسے شمع فروزان
اسے مطلع تہذیب کے خود مشید درخشان
حیرت زدگانوں سے ترانہ ہوسامان
بھارت کے مسلمان!

دعائی افکار کو کر پھر سے غزلخان
بھارت کے مسلمان!

ہرگز نہ بھلا تیر کا غالب کا ترانہ
بن جائے کین تیری حقیقت نہ فسانہ
قزاق نسا کو تو ہے درکار بہانہ
آماج نہ ہو قاسم و سید کا خزانہ

اسے قاسم و سید کے خزانے کے نگہبان

بھارت کے مسلمان!

خافکے ترنم کو بسا قلب و نظریں
ردی کے نغمہ کو بسا قلب و نظریں
سہمی کے نغمہ کو بسا قلب و نظریں
دے نغمہ ختم کو بسا قلب و نظریں

یہ نغمہ ہو پھر مہند کی دنیا میں پرافشان

بھارت کے مسلمان!

طوفان میں تو ڈھونڈ رہا ہے جو کنارہ
امواج لگا کر دیدہ باطن سے نظارہ
نکمن ہے کہ ہر موج نظر کو ہو گوارا
نکمن ہے کہ ہر موج بنے تیرا سہارا

نکمن ہے کہ ساحل ہو پس پردہ طوفان

بھارت کے مسلمان!

"مانند صبا خیز و وزیدن و گرا آموز
اندولکب غنچہ خستہ بدن و گرا آموز
در انجمن شوقی طلسمیدن و گرا آموز
نومید مشو نالہ کشیدن و گرا آموز"

اسے نو کہ لئے دل میں ہو فراز نیتان

بھارت کے مسلمان!

ظاہر کی محبت سے مروت سے گزر جا
باطن کی عداوت سے کدورت سے گزر جا
بے کار و دل افکار قیادت سے گزر جا
اس دور کی بوسیدہ سیاست سے گزر جا

اور غم سے پھر تمام ذرا دامن ایمان

بھارت کے مسلمان!

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تو
نامحرم ہر جرات زندانہ ہوا تو
آبادی ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تو
تو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تو

نکمن ہو تو پھر ڈھونڈ گنواؤ ہوسامان

بھارت کے مسلمان!

آجیر کی درگاہ مٹی تری جاگیر
محبوب الہی کی زمین پر تری تویر
ذرات میں کھیر کے فروزاں تری تویر
ہانسی کی فضاؤں میں تری کیفیت کی تاثیر

سرہند کی مٹی ہی تری دم سے فروزاں

بھارت کے مسلمان!

ہر ذرہ دہلی ہے تری ضو سے منور
پنجاب کی مٹی اثر جذبِ قلندر
گنگوہ کی تقدیس ہے قدوس سراسر
پٹنہ کی زمین نکمتِ خواجہ سے مسطر
میراس کی مٹی بن نہاں تاج شہیدان

بھارت کے مسلمان!

بٹامی و بھری و معری و غزالی
جس علم کی جس فکر کی دنیا کے تھوڑی
حیرت ہے تو اب ہے اسی دنیا میں سولی
ہے گوشہ بستی میں تری ہمت عالی
افسوس صد افسوس تری گنگی داماں

بھارت کے مسلمان!

ماحول کی ہوتا زہ ہو اٹھ بکھو گوارا

مذہب جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہے پیارے
نفرت سے پر اس کا ہر اک طور ہی پیارے
مذہب پہ تعصب تو بڑا جو رہے پیارے
عقل و خرد و علم کا یہ دور ہے پیارے

اس دور میں مذہب کی ملوثت ہو جائے

بھارت کے مسلمان!

اسلام تو نور و محبت کا بیان ہے
اخلاص کی روداد و مردت کا بیان ہے
ہر شعبہ ہستی میں صداقت کا بیان ہے
اک زندہ و پایندہ حقیقت کا بیان ہے

کیون دل میں تری ہو نہ حقیقت یہ فروزاں

بھارت کے مسلمان!

اسلام کی تعلیم فراموش ہوئی کیون
انسان کی تعلیم فراموش ہوئی کیون
افراد کی تنظیم فراموش ہوئی کیون
اخلاص کی تعلیم فراموش ہوئی کیون

حیرت میں ہوں میں دیکھ کر یہ عالمِ نہاں

بھارت کے مسلمان!

درکار ہے تہذیب کو پھر تیرا سہارا
کرا آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارہ
چمکے گا پھر اک بار ترے بخت کا تارہ

ہو جائے گی تاریکی ماحول گریزاں

بھارت کے مسلمان!

مماثر

از سید رضا من حسین صاحب گویا جہان آبادی

زخم کس سے دکھا کر جاتے ہیں
ناز ہے پردہ حشریم ناز
راہِ ہم ہیں تو راہِ ہر شے
راہِ ماضی کے سب نقوش کہاں
خلوت و انجمن میں فرق نہیں
اشکِ رنگین و سجدہ ریزی کیا
کون ہے ہر خموش آنسو میں
بجلیاں گرتی ہیں نظاروں پر
سنگِ درپر رہے گا نقشِ جبین
اشکِ پوچھوں کہ عرضِ حال کروں
عشقِ مجبور ہے نہ ہے محنتِ ار
غم کے طوفانِ بڑھا کے دنیا میں
دل کا ہر نقش ہے زبانِ گریا

ہم یونہی مسکرائے جاتے ہیں
کس سے جلوہ چھپا کر جاتے ہیں
اپنے معنی بتائے جاتے ہیں
کچھ ستاروں میں پائے جاتے ہیں
دونوں پر وی اٹھا کر جاتے ہیں
راہِ اُن کی سچائے جاتے ہیں
کچھ اشارے سچائے جاتے ہیں
یوں بھی پردے اٹھا جاتے ہیں
یاد اپنی دلائے جاتے ہیں
ملفقت تو وہ پائے جاتے ہیں
دونوں پہلو بتائے جاتے ہیں
پارہ بڑے لگائے جاتے ہیں
کیا کہیں کیا سنا کر جاتے ہیں

خطبات جمعہ و خطبات

خطبات جمعہ و خطبات { مؤلفہ جناب مولانا ابوالناظر ذاکر حسن صاحب مظاہری
موعظہ جلد اول { تقطیع بڑی ضخامت ۳۵۹ صفحات کاغذ کتابت و لمبا

معمولی قیمت جلد عاریتہ کتاب گھر بے مسجد کراچی بنگلہ نمبر ۱

جمعہ کا خطبہ مخلوط عربی اور اردو میں پڑھنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر نماز جمعہ ہی کا ایک ایسا موقع ہوتا ہے جس کے ذریعہ بغیر کسی اہتمام کے مسلمانوں کے کانوں تک مذہبی مسائل اور دینی ضروریات کی باتیں پہنچائی جاسکتی ہیں، مگر سامعین عموماً عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں، ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے فاضل مؤلف نے عربی کے یہ خطبات اور اردو کے مواظ تالیف کئے ہیں، اس جلد میں محرم سے لے کر جمادی الثانی تک ہر مہینہ کے پانچ پانچ عربی کے خطبے اور اسی قدر اردو کے مواظ تالیف کئے ہیں، جن کو عربی کے خطبہ سے پہلے یا نماز جمعہ کے بعد پڑھ کر سنایا جاسکتا ہے، اس طرح خطبہ کے لئے عربی زبان کی شرط بھی پوری ہو جاتی ہے، اور مسلمانوں کی اصلاح اور وعظ و تذکیر کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے، عربی کے خطبوں میں ہر مہینہ کے مناسب مسائل کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اور اردو کے مواظ میں عقائد و عبادات سے لے کر معاملات و اخلاق تک دین کے ان تمام ضروری مسائل اور اہم روایات کو بیان کیا گیا ہے، جن کا جاننا ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، انداز بیان مؤثر و دلنشین ہے، خطبات کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں مساجد کے ائمہ ان کے اوقات

متولیوں کے متعلق ضروری مسائل اور وعظ و تذکیر کے موثر طریقے تحریر کئے گئے ہیں، اور فقہ حنفیت سے خطبہ جمعہ کی زبان کی تحقیق کی گئی ہے، اس قسم کے اور خطبات بھی مرتب کئے گئے ہیں، مگر ان خطبات میں بڑی جانتی ہے، اور وہ مسلمانوں کی جملہ دینی ضروریات پر حاوی ہیں، اس لئے ائمہ مساجد کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے،
مضمون نگاری جلد اول { انجناب افتخار صاحب دہلوی تقطیع اوسطا ضخامت ۲۴۰ صفحے کاغذ
کتابت و طباعت بہترین قیمت جلد سے بغیر مجلد عاریتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار دار
جامع مسجد دہلی نمبر ۱

یہ کتاب مصنف نے فن مضمون نگاری پر لکھی، اس مضمون نگاری کا تعلق زیادہ تر علمی اور ادبی مسئلوں اور مشق و مہارت سے ہوا تاہم ایک حد تک بعض امور کا لحاظ رکھنے سے مضمون نگاری کی مشق مہارت میں سہولت پیدا ہوتی، اور اس کی پہلی بین مدد ملتی ہے، الا ان مصنف نے جو خود ایک کلمہ مشق اویب میں، اپنے ذاتی تجربے اور فنی حیثیت سے اس کتاب میں مضمون نگاری کے اصول و قواعد اور ظاہری و ضمنی حیثیت سے کامیاب مضمون نگاری کے طریقے بڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں، اور اس محدود موضوع پر معلومات کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے اور ادبی بصیرت کے لئے دیباچہ اور شاعرانہ نظم و نثر کے نمونے اور ان سے متعلق ادبی نکات بھی تحریر کر دیئے ہیں اور کتاب کے آخر میں دہلی کی قدیم علمی و تاریخی یادگاروں میں مولوی امام بخش مہبائی قدیم عربی اور موجودہ دہلی کالج اور دہلی کی قدیم تاریخی آبادی عرب سرائے کی تاریخ، اس کی عمارتوں اور اس کے ساکنین کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں، جس سے اس کتاب کی افادیت زیادہ بڑھ گئی ہے، اور اس کے خشک مضمون میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے،

مقالہ ص ۱۳۸ { انجناب مولوی عبدالحمد صاحب صادم فاضل جامع ازہر پروفیسر عربی

یونیورسٹی اور ٹیلی کالج لاہور تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۴۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہترین قیمت جلد

بغیر مجلد عاریتہ حکیم عبدالحفیظ صاحب صدر فی ادارہ علمیہ دہلی رام روڈ انارکلی لاہور

یہ کتاب مصنف کے مضامین اور تلخیصات و تراجم کا مجموعہ ہے مضامین میں اسلامی نظریہ تعلیم، خواتین، قید خانے اور سزائیں، عورت اور تہج قرآن پر ایک نظر اور تلخیص و تراجم میں مجرم نیچے، قرون وسطیٰ میں نظام رسل و رسائل، برڈی اچیو میٹیاں ہیں، مصنف سے جس معیار کے مضامین کی توقع تھی، وہ اس مجموعہ سے پوری نہیں ہوتی، ان کے بعض طبعزاد تو کسی قدر غنیمت ہیں، مگر تلخیصات و تراجم تو بہت سلی ہیں، مصنف کی تحریر میں بھی ان کی ہندیت پر اظہار غالب نظر آتی ہے، اور مضامین میں جا بجا نامائوس عربی الفاظ بلکہ پورے پورے عربی فقرے ذوق پر بہت گران گذرتے ہیں، یہ انداز تحریر اردو کے لئے بالکل بے جڑ ہے، ان خامیوں کے باوجود یہ مجموعہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

ترجمانِ اسرار، از انریل جسٹس عبدالرحمن جج ہائی کورٹ لاہور، قیطع بڑی،

نخاست ۱۲۴ صفحہ، کاغذ نفیس، ٹائپ روشن و دیدہ زیب قیمت مجلد سے رپتہ

مکتبہ کاروان ایک روڈ لاہور،

ترجمانِ اسرار، اسرارِ قبائل مرحوم کی شہرہ آفاق مثنوی اسرارِ خودی کا منظوم اردو ترجمہ ہے، ترجمہ میں نثر کے ادبی محاسن کو قائم رکھنا مشکل ہے، اور نظم کی خوبیوں کا توازن بھی دشوار ہے، اس قسم کے تراجم کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اصل کے مفہوم و منشا میں فرق نہ آنے پائے، اور ترجمہ کی زبان میں سلاست قائم رہے، اس لحاظ سے یہ ترجمہ کامیاب ہے، اور اصل کا مفہوم و منشا پوری طرح ادا ہو گیا ہے اور فارسی زبان کی حلاوت و فصاحت، لطافت ادا، الفاظ اور ترکیبوں کے حسن سے قطع نظر جس کا قائم رکھنا اردو میں ممکن نہ تھا، نفس ترجمہ میں بڑی حد تک سلاست و روانی قائم ہے، اور بیشتر اشعار ترجمہ نہیں معلوم ہوتے، کتاب کے شروع میں اقبا لیاات کے سب سے بڑے، ہر اور شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں اقبال کے فلسفہ خودی اور ان کی تعلیمات پر مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، فاضل مترجم اس حیثیت سے لائق مبارکباد ہیں کہ اپنے عہد کی مشغولیتوں

دشمنک قانونی مونگائیوں کے باوجود ادبی مذاق قائم رکھنا ایک مفید علمی ادبی خدمت بھی انجام دیدی اس ترجمہ سے اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک نئی قیمت اضافہ ہوا،

المہمانِ قلب از جناب سید اسد الرحمن صاحب قدسی قیطع اوسطا، نخاست ۱۰۸ صفحہ، کاغذ

دستی، نفیس قیمت مجلد غیر پتہ :- گوشتہ ادب لاہور،

عام طور سے نا اشنائے حقیقت مرد و جہ تصوف و طریقت پر جو کتابیں لکھتے ہیں، ان کو شریعت اور کتاب و سنت سے بہت کم علاقہ ہوتا ہے، یا کم از کم وہ رطب و یابس سے خالی نہیں ہوتیں، مگر مذکورہ بالا کتاب اس سے مستثنیٰ ہے، اس میں آیات قرآنی کی روشنی میں حقیقی اسلامی تصوف کی جو شریعت کی روح اور اس کا مغز ہے، وضاحت کی گئی ہے، اور اس کے اجزاء و عناصر، لوازم و شرائط، اس کے حصول کے ذرائع و وسائل اعمال و مجاہدات اور آد و وظائف اور آدعیہ ماثورہ کو اختصار و جامعیت کے ساتھ زیرِ کیا گیا ہے، کتاب تصوف کا مذاق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

کاروان و منزل از جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی قیطع اوسطا، نخاست ۲۲۴ صفحہ، کاغذ

کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد غیر پتہ سنگم گھرار دو بازار جامع مسجد دہلی،

کاروان و منزل مصنف کے کلام کا مجموعہ ہے، وہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ کاغذی جی کے پیچھے مقلد اور قوم وطن کے پرانے خادم بھی ہیں، انشاء سے لے کر شاعری تک ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں برابر شریک رہے، اور اس ماہ میں قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلین، ان کی اس زندگی اور ان کے سیاسی عقائد و خیالات کا عکس ان کی شاعری میں بھی ہے، چنانچہ اس مجموعہ کا بڑا صدیقی و سیاسی نظموں پر مشتمل ہے، اور ان میں تحریک آزادی کے مختلف مراحل اس کے مختلف رُخوں، اس سے متعلق متفرق حالات و واقعات کی تصویریں ہیں، اور اس حیثیت سے یہ مجموعہ ایک محب وطن کے جذبات و اثرات کا دلچسپ مرقع جو ان کے علاوہ مختلف موضوعوں پر کچھ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، مگر ان کا طرز بھی

عام رنگ سے مختلف ہے، اور محض خیال آرائی کے بجائے ان میں بیشتر کسی نہ کسی حقیقت کی ترجمانی گئی ہے، خاص تغزل کا رنگ بھی سحر ہے، مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ مصنف کی کلمہ شغفی کا نمونہ ذوق کے مطابق کے لائق ہے،

اقوال اشرف مرتبہ جناب پروفیسر عبدلنن صاحب سید ل تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ روپے اقبال بک ڈپو پٹنہ،

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات، دینی و اخلاقی فوائد اور دنیوی و اخروی فوائد سعادت کا گنجینہ ہیں، لائق مرتب نے اس کتاب میں مذہبی و روحانی تعلیمات ظاہری و باطنی و مومن و مصلح اور عام فائدہ حقائق و معارف وغیرہ سے متعلق حضرت مولانا کے تین سو منتخب ملفوظات جمع کئے ہیں یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن فائدہ کے لحاظ سے ضخیم کتابوں پر فوقیت رکھتا ہے، کتاب کے مرتب میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر سوانح اور ان کے اور کارناموں پر تبصرہ ہے،

رسول عربی از جناب سید فرید الوحیدی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ روپے قومی کتاب گھزدیو بند،

اس کتابچہ میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے بچوں کے لئے آسان زبان میں سوانح نبوی سیرت پاک کے مختصر حالات تحریر کئے گئے ہیں، اور ہر سبق کے متعلق مشقی سوالات بھی دیئے ہیں، کتاب بچوں کے پڑھانے کے لائق ہے،

”م“

جلد ۶۹ مآجمادی الثانی ۱۳۸۵ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۲ء عدد ۳

مضامین

شاد معین الدین احمد ندوی ۱۶۲-۱۶۴

شذرات

مقالات

ڈاکٹر نذیر احمد ایم اے پی، ایچ ڈی، ۱۶۵-۱۹۲

محکمہ ابراہیم و خوان خلیل

ڈی سی لٹ، لکھنؤ یونیورسٹی،

نواب جعفر علی خان اشرف لکھنؤی ۱۹۳-۲۰۲

پہ زبان کے دعویدار

جناب عبد المجید صاحب اسٹنٹ ڈائریکٹر ۲۰۳-۱۱۵

روحانی دنیا

اسلامک اسٹڈیز بہار پٹنہ،

اشاہد کی موثر مستشرقین عالم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ - پیرس ۲۱۶-۲۲۸

حضرت مفتی عنایت احمد رحمۃ اللہ علیہ اور بریلی از مولانا سید بدر الدین صاحب استاذ ۲۲۹-۲۲۶

عربی مسلم یونیورسٹی،

کاکب خانہ،

مطبوعات جلیک ۸۰

”م“ ۲۳۶-۲۳۸